ماہنامہ

فکرِ نو

علی گڑھ

ستمبر ۲۰۱۹ء

مدیر

رياض الرحمٰن شروانی

نائب مدیر

مدیح الرحمٰن صہیب

ماہنامہ

فکرِ نو

علی گڑھ

جلد ۳ — ستمبر ۲۰۱۹ء — شمارہ ۲

قیمت فی شمارہ: ۲۵ روپے

قیمت سالانہ: ۲۵۰ روپے

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ:
Dr. Madihur Rahman Sherwani
Habib Manzil, Marris Road, Aligarh-202002 (U.P.)
fikrenaualigarh@gmail.com

براؤن بکس، علی گڑھ

فہرست

نوٹ: مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ہر تحریر کی اخلاقی وقانونی ذمہ داری کو پیش نظر رکھیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ کاپی رائٹ سے وابستہ کسی اصول کی قانون شکنی نہ ہو۔

(مدیر)

اداریہ

تین طلاقیں

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی

اسلام کے مختلف مسالک میں یہ باعث اختلاف رہا ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں تین ہوتی ہیں یا ایک۔ حنفی مسلک میں تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت حنفی مسلک کی پیرو ہے۔ اس لئے یہاں زیادہ تر اسی کا رواج رہا ہے۔ نکاح اور طلاق مسلم پرسنل لاء کا حصہ ہیں اور یہاں کے علماء کی رائے ہے کہ پرسنل لاء میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ لیکن وقت کا تقاضہ بعض تبدیلیوں کے حق میں ہے اور کئی اکثریت کی مسلم ممالک میں اُس میں (پرسنل لاء) بعض تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین ہندوستان کے نائب صدر جمہوریہ تھے اُس وقت یہ کوشش کی گئی کہ مختلف مسالک کے علماء ایک جگہ بیٹھ کر مسلم پرسنل لاء پر غور کریں اور جو تبدیلیاں ممکن ہوں وہ بروئے کار لائیں لیکن اس میں کامیابی نہیں مل سکی۔ جب شری راجیو گاندھی وزیر اعظم تھے تو اس معاملہ میں اُس وقت کی حکومت قلابازیاں کھاتی رہیں۔ جب ایک طرف کا دباؤ بڑھا تو یہ فیصلہ ہوگیا اور جب دوسری طرف کا دباؤ بڑھا تو دوسرا فیصلہ ہوگیا۔ خود ان کی کیبنٹ میں جو مسلمان حضرات تھے انھیں بھی اس معاملے میں اختلاف رائے تھا۔

میری ہمیشہ یہ رائے رہی ہے کہ مسلم پرسنل لاء میں اگر تبدیلی ہوسکتی ہے تو وہ قانون بنا کر ہی ہوسکتی ہے۔ ورنہ علماء کرام اس مسئلے پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

مسلم اکثریت کے ممالک میں یہ آسانی ہے کہ وہ جو قانون چاہے بنا سکتی ہے لیکن یہاں مسلمانوں کی اکثریت نہیں ہے یہاں کی حکومتوں کو ہمیشہ یہ تامل رہا کہ اگر وہ قانون بنائے گی تو اُسے مداخلت فی الدین قرار دیا جائے گا۔ اس لئے وہ اس سے باز رہیں۔ ہمارے آئین میں ایک طرف اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی یقین دہانی کرائی گئی ہے اور دوسری طرف حکومت کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مُلک میں یکساں پرسنل لاء رائج کرنے کی کوشش کریں۔ مشترک سول میں دشواری یہ ہے کہ وہ عملاً اکثریت کا سول لاء ہوجائے گا۔ آزادی کے بعد یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا کہ سرکاری درس گاہوں کو نصابِ تعلیم کا حصہ بنایا جائے یا نہ بنایا جائے۔ اس کی سب سے زیادہ مخالفت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مذہبی تعلیم کا مطلب اکثریتی فرقے کے مذہبی نظریات ہوجائے گا۔ انھیں اقلیتوں کے آئینی حقوق کا بھی لحاظ تھا۔ لیکن موجودہ حکومت نے پارلیامنٹ کے پچھلے اجلاس میں اس کی پرواہ نہ کرکے ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دے دیا ہے اور

ساتھ ہی تین طلاق دینے والے کو تین سال کی سزا بھی طے کردی ہے۔ ہم اس قانون کے پہلے جز سے متفق ہیں کیوں کہ اسلام میں اس کی گنجائش نکلتی ہے۔ اگر چہ بہتر یہی تھا کہ مسلمان یہ ترمیم خود کر لیتے اور حکومت کی مُداخلت کی ضرورت نہ پڑتی لیکن ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا جب تین طلاق ایک ہی طلاق ہوگی تو پھر تین سال کی سزا کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ اس کے جواب میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قانون بن جانے کے باوجود کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دے کر گھر سے باہر نکال دے تو اُس صورت میں کیا کیا جائے۔ اس بارے میں ہماری رائے ہے کہ قانون میں اس بات کی وضاحت ہونی چاہیے کہ تین سال کی سزا اُسی صورت میں دی جائے گی جب کوئی شخص قانون کی خلاف ورزی کرے گا۔ ورنہ نہیں—

ہم ایک مرتبہ پھر علماء کرام کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ اُنھیں دیوار پر لکھا ہوا پڑھنا چاہیے اور سول لاء میں ایسی ترمیمیں کرلینی چاہیے جو دوسرے ممالک بالخصوص ان ممالک میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہیں۔ مثلاً پاکستان میں یہ قانون بن گیا ہے کہ کوئی شخص پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر دوسری شادی نہیں کرسکتا اس طرح بعض دوسرے ممالک مثلاً مصر، ترکی وغیرہ میں بھی ترمیمات ہوئی ہیں تو پھر ہندوستان میں کیوں نہیں ہوسکتیں۔ یہ کہنا کہ ان ممالک کا کوئی فعل ہمارے لئے سند نہیں ہے، قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام اور اُس کے احکام ہر جگہ یکساں ہیں۔ تو اگر پاکستان، مصر اور ترکی کے علماء تبدیلی پہ راضی ہو سکتے ہیں تو ہندوستان کے علماء کیوں نہیں ہو سکتے۔ ہمیں اندیشہ یہ ہے کہ حکومت آہستہ آہستہ یکساں سول لاء بنانے کی طرف جاری ہے اور وہ مشترک سول کوڈ، جیسا کہ عرض کیا گیا اکثریت کا قانون ہوگا۔ اس لئے ہمیں خود پیش قدمی کر کے سول کوڈ میں ایسی ترمیمات کر لینی چاہئے جو دوسروں کو اس کا موقع نہ دیں۔

حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ ان کے رویے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ آئین میں بھی ترمیمات ہوسکتی ہیں۔ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں اپنے طور طریق میں لچک پیدا کرنی چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام کی قوانین ابدی ہیں او روہ وقت کے ساتھ تبدیل نہیں ہوسکتی لیکن ان قوانین میں جہاں جہاں خود اسلام نے ترمیم کی گنجائش رکھی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ جب کسی مسئلے میں مختلف مسالک کے درمیان اختلاف رائے ہو، وہاں وہ رائے اختیار کرنی چاہیے جو وقت کے تقاضوں کے مطابق جیسا کہ مختلف مسلم اکثریتی ممالک میں کیا گیا ہے۔ ان معاملات میں تنگ نظری سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ کشادہ نظری اختیار کرنی چاہیے۔ حکومتوں کو بھی آئین میں دیئے گئے حقوق کی پابندی کرنی چاہیے۔ ان میں اپنے نظریات کے مطابق ردوبدل نہیں کرنا چاہیے۔ حالیہ الیکشن کے بعد وزیر اعظم نے کہا تھا کہ وہ ان لوگوں کے دل جیتیں گے جنھوں نے ان کی پارٹی کو ووٹ نہیں دیے ہیں۔ دل جیتنے کا طریقہ یہی ہے کہ اقلیتوں کے جذبات کا لحاظ رکھا جائے اور ان کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ جبر و زبردستی سے کام نہیں چلے گا بلکہ کام افہام وتفہیم ہی سے چلے گا۔

ریاض الرحمٰن شروانی

نئے ہندوستان کے ''اکلویہ''

تحریر: ہرش مندر / مترجم: پروفیسر افتخار عالم خاں

یہ ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ جب غریب ماں باپ کے بچے، امیر گھرانوں کے بچوں کے ساتھ اسکولوں میں پڑھتے ہیں تو اُن کے درمیان طبقاتی اور ثقافتی امتیازات کی مشکلات ضرور درپیش رہتی ہوں گی۔ لیکن کچھ حساس اور ہمدرد اساتذہ جیسے ''اینی کوشی'' (Annie Koshy) یا حساس قسم کے اسکولوں کے سربراہ جیسے اڈمایرل اے۔ ایچ۔ تاہی لیانی (Adniral A.H. Tahiliani) کی مدد سے غریب خاندانوں کے بچے امتیازات کی ان گہری کھائیوں کو بآسانی پار کرلیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسکولوں کے ماحول سے مانوس ہونے اور گھلنے ملنے کی پوری ذمہ داری، جس طرح امریکہ میں افریقی نژاد بچوں کے ذمہ ہوتی ہے، اسی طرح ہمارے ملک میں غریب اور نادار طبقات کے بچوں کے اوپر ڈال دی جاتی ہے۔ نہ سہی پوری طرح سے، پھر بھی کسی حد تک، کیوں نہ امیر گھرانوں کے بچے بھی اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں اپنا حصہ نبھایا کریں۔ اس سلسلے میں ہم بہت کچھ ایک ''آئرش'' نرس، سسٹر سائرل مونی (Sister Cyril Mooney) کے ذریعہ کئے گئے کاموں سے سیکھ سکتے ہیں۔ وہ تقریباً بیس سالوں سے فٹ پاتھوں پر رہنے والی لڑکیوں کو پڑھانے کے لئے سیالدہ کے ایک نہایت اعلیٰ ''لاریٹو اسکول'' میں داخلہ کراتی چلی آرہی ہیں، جن کی فیس اس اسکول میں پڑھنے والے امیر گھرانوں کے بچوں کے والدین، رضاکارانہ طور پر (بخوشی) ادا کرتے تھے۔ انھوں نے نہایت عمدگی سے اس اسکول میں، ایک اس طرح کا ماحول بنایا تھا جس میں دونوں طرح کے بچے، برابری کے ساتھ، گھل مل کر ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکیں، اس ماحول کو مرتب کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھا گیا تھا۔ سسٹر کو معلوم تھا کہ غریب، فٹ پاتھ پر رہنے والے بچوں کو ابتدا میں ''بند جوتے'' پہننے میں خاصی تکالیف ہوتی تھی، اسی لئے انھوں نے اسکول میں یہ قاعدہ نافذ کردیا تھا کہ اسکول کے اندر، چھٹی کلاس تک کے سب ہی بچے ننگے پیر رہیں گے۔

اگر کبھی کوئی بچہ عمدہ گھڑی باندھ کر اسکول آجاتا تھا تو وہ اُس کو اپنے آفس میں بلاکر پوچھتیں تھیں کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان قیمتی چیزوں کے استعمال سے تم اپنے دوستوں میں زیادہ مقبول ہوجاؤ گے۔

میں بہت سی ایسی بچیوں سے ملا تھا جو پہلے فٹ پاتھ پر رہا کرتی تھیں جو بعد میں ''لاریٹو اسکول'' میں پڑھنے کے بعد نہایت خوداعتماد اور پرامید نظر آنے لگی تھیں۔ میں بہت سے امیر گھرانوں کے اُن بچوں سے بھی ملا تھا جو ''لاریٹو اسکول'' سے پڑھ کر نکلے تھے یا پڑھ رہے تھے، اُن کو فخر تھا کہ اُن کے اسکول

میں غریب اور امیر بچے برابری کے ساتھ پڑھ لکھ کر بڑے ہوئے تھے۔ سسٹر ماپیرل کا کہنا تھا کہ جب ہم اپنے ہاتھوں ہی اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں تو کیوں نہ ہم اپنے مشفقانہ ہاتھوں سے اپنے مسائل حل کریں۔

اس سلسلے میں ایک نہایت تکلیف دہ واقعہ ٹیلی ویژن کی ایک ''نیوز ریڈر'' سونیا سنگھ نے ''آوٹ لوک'' میں شایع کیا تھا، جس میں انھوں نے آج کے ہندوستان کی ایک عریاں تصویر پیش کردی تھی، انھوں نے ایک پانچ سال کے بیٹے کی ماں ہونے کے بطور یہ واقعہ تحریر کیا تھا، اُن کا پانچ سال کا بیٹا ایک نہایت عمدہ اسکول میں پڑھتا تھا جہاں ان کے ساتھ بہت سے غریب خاندانوں کے بچے بھی پڑھتے تھے اسکول میں ایک ''ٹیچرز ڈے'' کے فنکشن میں اُن کی ملاقات ایک غریب بچے کے والد سے ہوئی تھیں، انھوں نے اُن سے پوچھا تھا کہ اُن کا بچہ اسکول میں کیسا چل رہا ہے، آپ کو اُس کے سلسلے میں کوئی دقت تو پیش نہیں آرہی ہے۔ غریب بچے کے والد نے جواب کے طور پر بتلایا تھا کہ ویسے تو سب ٹھیک چل رہا تھا سوائے ایک مشکل کے، جو اُس وقت اُسے پیش آئی تھی، جب ایک امیر گھرانے کے بچے نے میرے بیٹے کو اپنی سالگرہ کے موقع پر اپنے گھر میں ہونے والی پارٹی میں مدعو کیا تھا، میرا بیٹا اس پارٹی میں شریک ہونے کے خیال سے بہت خوش تھا، لیکن اُس کے والد کے سامنے ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ بہت چھوٹا تھا اور اکیلے وہاں نہیں جا سکتا تھا اس لئے اُس کے ساتھ اس کی ماں کا جانا ضروری تھا، اُس بچے کے والد نے بتلایا تھا کہ اس طرح پارٹیوں میں دو طرح کے لوگ چھوٹے بچوں کے ساتھ جاتے ہیں، یا تو یہ بچے اپنے نوکروں کے ساتھ وہاں جاتے ہیں، جیسے اپنی آیاؤں یا اپنے ڈرائیوروں وغیرہ کے ساتھ، ان میں ڈرائیور تو عموماً باہر اپنی کاروں ہی میں بیٹھے رہتے ہیں لیکن آیاؤں کو علیحدہ کسی کمرے میں بٹھلا دیا جاتا ہے۔ دوسرے بچے اپنے والدین کے ساتھ ان پارٹیوں میں جاتے ہیں جن کو آؤ بھگت کے ساتھ گھر کے اندر اُس جگہ لے جایا جاتا ہے جہاں اصل فنکشن ہو رہا ہوتا ہے۔ اُس غریب بچے کے والد کو سب سے فکر اس بات کی تھی کہ اُس کے بیٹے پر اُس وقت کیا گزرے گی جب اُس کی ماں کو علیحدہ آیاؤں کے کمرے میں بٹھلا دیا جائیگا۔

2012 میں عام تعلیم کی گارنٹی کے قانون کے تحت سپریم کورٹ نے بچوں کے لئے اسکولوں میں 25 فیصد نشستیں مخصوص کرنے کے عمل کو جائز ٹھہرایا تھا، لیکن اس کے باوجود یہ ''اعلیٰ اسکول'' نہایت چالاکی اور بے شرمی کے ساتھ کسی نہ کسی بہانے اس عمل کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

''آوٹ لوک'' میں پرکاش کی کہانی شایع ہوئی تھی، پرکاش بنگلور میں دودھ بیچا کرتا تھا، وہ بہت خوش تھا کہ اس ریزرویشن کے قانون کے تحت اُس کی بیٹی کا ایک نہایت عمدہ ''انٹرنیشنل اسکول'' میں داخلہ ہو گیا تھا، لیکن اس کو بتلایا گیا کہ اُس کو ہر مہینہ 48 ڈالر کی فیس ڈالر ہی میں ادا کرنی ہوگی، کیونکہ یہ ایک ''انٹرنیشنل'' اسکول ہے، اسکول کے منتظمین نے اُس کو بتلایا تھا کہ ''فری تعلیم'' صرف ٹیوشن فیس سے متعلق ہوتی ہے لیکن یہ 48 ڈالر ٹیوشن فیس کے علاوہ دوسرے اخراجات سے متعلق ہیں جو اُس کو ہر مہینہ ادا کرنے ہونگے۔ اس وقت 48 ڈالر زرمبادلہ کی در سے پانچ ہزار روپیہ مہینہ کے برابر تھے، جو پرکاش کی کل آمدنی کے 90 فیصد کے برابر تھا۔

بنگلور کی ایک ''رایٹ ٹو ایجوکیشن'' کی تنظیم کے سربراہ کے

مطابق ان اسکولوں میں یہ ''دوسرے اخراجات'' نہایت چابکدستی سے مرتب کئے جاتے ہیں، ایک اسکول میں سات ہزار روپیہ سالانہ صرف خوش خطی کی مشق کروانے کے لئے وصول کئے جاتے تھے، ایک دوسرے اسکول میں ''ستاروں'' کا مشاہدہ کرنے کے ٹیٹوریل کے ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ لئے جاتے تھے، ایک اور اسکول میں چار ہزار روپیہ کمپیوٹر ٹریننگ اور دو ہزار روپیہ سالانہ تیراکی کی ٹریننگ کے لئے وصول کئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ تقریباً آٹھ ہزار روپیہ والدین کو کتابوں اور یونیفارم کے اخراجات کے بطور جمع کرنے ہوتے تھے، حالانکہ ''رائٹ ٹو ایجوکیشن'' کے قانون میں اسکولوں کو واضح طور پر ہدایت دی گئی تھی کہ غریب خاندانوں کے بچوں کو یہ سب مراعات مفت فراہم کی جائیں۔

ناگیپاراوٗ کی رپورٹ کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ یہ اعلیٰ پرائیویٹ اسکول غریب بچوں کے والدین کو ڈرانے اور اپنے اسکول سے دور رکھنے کے لئے پہلے سے خبردار کرتے ہیں کہ وہ اسکول کے ذریعہ منظم کئے گئے طلبا کے بیرونِ ملک دوروں (یعنی انٹرنیشنل ٹرپ) کے لئے درکار تین لاکھ روپیوں کی رقم کس طرح ادا کریں گے۔ غرض یہ اسکول ہر وہ حربہ استعمال کرتے ہیں جس کے ذریعہ غریب طبقات کے بچوں کو اپنے اسکولوں سے دور رکھ سکیں۔

دراصل غریب طبقات کے بچوں کو اعلیٰ اسکولوں میں داخلے کی مخالفت کرنے کی اس مہم کے پس پردہ ہمارے میڈل کلاس کا وہ کھوکھلا وہم اور احساس شامل حال رہتا ہے کہ کس طرح اُن کے بچوں کے ساتھ اُن کے نوکروں کا بچہ یا فٹ پاتھ پر رہنے والا بچہ ایک ساتھ بیٹھ سکتے ہیں، یا ایک دوسرے سے دوستی کر سکتے ہیں، اسی کے ساتھ شاید اُن کو یہ خوف بھی ستاتا رہتا ہے کہ کہیں اُن کے نوکروں کا بچہ خود اُن کے اپنے بچے سے زیادہ اچھا اور ہونہار طالب علم نہ ثابت ہو جائے جس طرح ایک جنگلی قبیلے کا لڑکا ''اکلاویہ'' پانڈوؤں کے اعلیٰ خاندان کے شہزادوں سے بہتر تیرانداز بن گیا تھا۔

میں پہلے بھی اپنے اُن کاموں کے بارے میں لکھ چکا ہوں، جن کے دوران میں نے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر تقریباً 300 ''اکلاویوں'' (جن میں لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں شامل تھیں) کے ساتھ دہلی میں، اور اسی کے ساتھ حیدرآباد، پٹنہ، چنائی، کلکتہ اور بنگلور میں تقریباً 3,500 فٹ پاتھ پر رہنے والے بچوں کے درمیان رہ کر اُن کی بہبود کے لئے کام کیا تھا۔ یہ وہ بچے اور بچیاں تھیں جو زندہ رہنے کے لئے فٹ پاتھوں، ریلوے اسٹیشنوں وغیرہ پر بھیک مانگتے تھے یا کوڑا کرکٹ جمع کر کے بیچتے تھے یا جیبیں کاٹتے تھے۔ لیکن صرف ایک دو سال کی دیکھ ریکھ کے بعد ہی اُن کے اپنی سابقہ زندگی کے ظلموں کے زخم بھرنے لگے تھے، انھوں نے نشیلی دواؤں کا استعمال یا اسی طرح کی دوسری بُری عادتیں چھوڑنا شروع کر دی تھیں اور باقاعدہ اسکولوں میں جانا شروع کر دیا تھا، اُن پرائیویٹ اور گورنمنٹ اسکولوں میں یہ نوخیز کلیاں آہستہ آہستہ کھلنے لگی تھیں — انھوں نے نہ صرف محنت سے پڑھنا شروع کر دیا تھا بلکہ مختلف ثقافتی اور غیر ثقافتی سرگرمیوں میں بھی اُن کے مختلف جوہر نمایاں ہونے لگے تھے۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ اُن متمول (امیر) خاندانوں کے بچوں کے مقابلے میں جن کو بآسانی ایک معمول کے بطور تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم ہو جاتے ہیں ہمارے بچے صحیح معنی میں تعلیم کی قدر و منزلت جانتے ہوئے محنت اور لگن سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

☆☆☆

مجالس مختار

(۲۰ فروری ۱۹۹۰ء، علی گڑھ)

سید احتشام احمد ندوی

آج میں نے پروفیسر مختار الدین احمد صاحب آرزو سے ملاقات کی۔

حضرت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جو کتابیں دائرۃ المعارف العثمانیہ سے شائع ہوتی ہیں ان کے پروف وہاں کے مصحح پڑھتے ہیں۔ یہ مصحح بہت لائق فائق ہوتے ہیں۔ وہ مدرسہ نظامیہ سے درس نظامی پڑھ کر سند فضیلت حاصل کرتے ہیں۔ یہ مصحح بڑی توجہ سے پروف دیکھتے ہیں اور جو کتابیں اور مخطوطات دائرۃ المعارف العثمانیہ سے چھپتی ہیں ان کے پروف میں ان کی توجہ سے کوئی نحوی اور صرفی غلطی باقی نہیں رہ جاتی اور وہ گرامر پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں۔

فرمایا کہ کسی مسئلہ میں پروفیسر عبدالحلیم صاحب نے مصحح سے اختلاف کیا مگر مصحح بھی اپنے موقف پر اڑا رہا بعد اور اس نے ڈاکٹر عبدالحلیم کی رائے کو تسلیم نہیں کیا۔

اب میں اپنی یادداشت سے ایک دوسرا ملفوظ اس میں شامل کر کے اس کو بڑھا دیتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب سے ذکر نکلا مولانا سید ریاست علی ندویؒ کا۔ فرمایا کہ انھوں نے تاریخ صقلیہ لکھا وہ تاریخ اندلس لکھ رہے تھے مگر اصلاً ان کی دلچسپی سیاست سے تھی اور وہ کانگریس کی سیاست میں عملی دلچسپی لیتے تھے جس کو حضرت سید سلیمان ندویؒ پسند نہیں کرتے تھے۔ اتفاقاً ایسا ہوا کہ پٹنہ میں مدرسہ شمس الھدیٰ میں ایک جگہ نکلی پرنسپل کی اور مولانا سید سلیمان ندویؒ اس میں بحیثیت اکسپرٹ شریک ہوئے۔ انھوں نے موقع کو غنیمت سمجھا اور مولانا سید ریاست علی ندویؒ کا اس مدرسہ کے پرنسپل کی حیثیت سے تقرر کر دیا۔ اس طرح دراصل ان کی سیاست سے دارالمصنفین کو بچایا۔

اب پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے فرمایا کہ مولانا سید ریاست علی ندویؒ نے ۴ جلدوں میں مسلم اسپین کی تاریخ مکمل کر لی تھی۔ دوسری جلد غائب تھی مگر کاغذات میں وہ جلد بھی مل گئی اور شائع کر دی گئی۔ انتقال سے قبل سید ریاست علی ندویؒ نے تمام جلدوں کے مسودہ کو اپنے بیٹے کے سپرد کر دیا تھا انھوں نے دارالمصنفین سے رابطہ کر کے یہ سارا مواد محترم عالی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کے سپرد کر دیا اور اب وہ پوری کتاب شائع ہو رہی ہے۔ تاریخ صقلیہ پر دو جلدوں میں بہت پہلے اُن کا کام شائع ہو چکا ہے اب اندلس کی تاریخ پر ان کا محققانہ کام شائع ہو جانے پر اندلس کی تاریخ پر یہ کام مکمل ہو جائے گا۔ انشاء اللہ

مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ سید ریاست علی ندویؒ کی زیارت سے میری آنکھیں شاد ہوئیں۔ وہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ سے ملاقات کرنے جامعہ ملیہ اسلامیہ تشریف لائے۔ میں جامعہ ملیہ میں ندوہ کے بعد انگریزی پڑھ رہا تھا۔ مولانا عبدالسلام قدوائی نے فرمایا کہ یہ احتشام احمد ندوہ کے فاضل ہیں اور عربی اچھی لکھ لیتے ہیں۔ مولانا سید ریاست علی ندویؒ نے فرمایا کہ ان کی جگہ سعودی عربیہ میں ہے۔

دورانِ گفتگو انھوں نے فرمایا کہ تحقیق کا کام تو صرف دارالمصنفین میں ہو سکتا ہے۔ میں پٹنہ میں بیٹھ کر یہ کام نہیں کر سکتا۔ مگر تاریخ اندلس پر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے نوٹس لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ کام کا پورا خاکہ بنا لیتے تھے پھر اس خاکہ کے مطابق تاریخ لکھتے تھے۔ یہ پورا خاکہ تاریخ اندلس کا انھوں نے لکھ لیا تھا پھر اس خاکہ کے مطابق تاریخ اندلس لکھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ان کی مرتب کی ہوئی کتاب کی تمام جلدیں دارالمصنفین سے شائع ہو رہی ہیں اور اس میں دارالمصنفین کے ڈائرکٹر صاحب کی خاص توجہ اور دلچسپی کو بھی بڑا دخل ہے کہ مولانا سید ریاست علی ندویؒ کی یہ ذہنی کاوش ان کے انتقال کے اتنے دنوں بعد شائع ہو رہی ہے ان کے صاحبزادے نے بھی ان مجلدات کے مسودہ کو سنبھال کر رکھا اور دارالمصنفین کے سپرد کر دیا۔ اللہ مصنف اور ان کے صاحب زادے کو اس امت کی طرف سے اجر عظیم عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

البیلا نثر نگار

غلام احمد فرقت کاکوروی کے غیر مطبوعہ خطوط بنام ڈاکٹر محمد حسن

پیشکش: ڈاکٹر فرد الحسن

ڈیر ڈاکٹر! میری ایک کتاب ''مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں'' کے عنوان سے نسیم بکڈ پو لکھنؤ سے شائع کی ہے، مگر اسے دختِ افراسیاب بنا رکھا ہے۔ آپ جہاں تمام ''چماران ملت'' کے ادبی کارناموں اور اعمال ناموں پر تنقید کی ٹارچ لائٹ ڈالتے ہیں، وہاں اس نجیب الطرفین یتیم کی کتاب کا بھی اپنی ریڈیائی تبصروں میں ذکر کر دیا کریں۔

بے پردگی کے خیال سے چونکہ ناشر صاحب نے مجھے بھی کوئی کتاب نہیں دی اس لئے میں اسے بھیجنے سے معذور ہوں۔ آپ ان ہی کو خط لکھ کر طلب کر سکتے ہیں۔ ایک دوسری چیز جو دریافت طلب ہے وہ یہ کہ حضور والا آج کل کس چکی کا پسا کھا رہے ہیں؟ کیوں کہ جتنے ہارس پاور سے آپ مضامین، ریڈیائی فیچر اور تنقیدی مقالات لکھتے ہیں وہ رئیس احمد جعفری کو بھی آئینہ دکھاتے نظر آتے ہیں، خدارا اس چکی کا نمبر ہی بتا دیجئے۔ میں حیران ہوں کہ آپ اتنا بوجھ کیسے برداشت کرتے ہیں؟ شادی کے بعد انسان سپر انداختہ نظر آتا ہے۔ اس میں ہرکلیز اور رستم سے لے کر گاماں پہلوان تک نظر آئے، مگر!

ع اسداللہ خاں قیامت ہے۔

معلوم نہیں تعمیر سری نگر کا پرچہ آپ کے پاس آتا ہے یا نہیں؟ اس میں میرا ایک مضمون ''غالب کا خط، عرشی رامپوری کے نام'' شائع ہوا تھا۔ اس کی اصل میرے پاس موجود نہیں ہے اگر آپ کے پاس وہ پرچہ محفوظ ہو تو اس کی کٹنگ مجھے بواپسی ڈاک بھجوا دیجئے۔ ایڈیٹر تعمیر کو کئی خط لکھ چکا ہوں مگر صدائے نہ برخاست۔ میں چونکہ کسی مضمون کی اصل اپنے پاس نہیں رکھتا، اس لئے بہت سے مضامین مرحوم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نسیم قریشی ''مرحوم'' کو میرا اسلام عرض کیجئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کنوارا ہی رٹائر ہوگا۔ اسے لاکھ غیرت دلائی کہ دیکھ اب تو ڈاکٹر محمد حسن تک نے شادی کر ڈالی، ع اب تو ظاہر ہوا ے نور اللہ کے! مگر اس شخص پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ (۱۳/ جنوری ۶۲ء)

●

حضور والا! آپ کا جواب مجھے اس وقت ملا، جب میں صبر وتحمل اور صبر ایوبی کا گلا گھونٹ کر مایوسی کے ہفت خوان طے کرنے لگا تھا اور کارڈ بھی بجائے ڈاکیہ کے ایک دوکاندار نے لا کر دیا۔ بات یہ ہے کہ میرے محلّہ میں جو ڈاکیہ اب نیا متقرر ہوا ہے، اس میں حال و مستقل دونوں کے وزیر ہونے کی صلاحتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں، اور وہ اس درجہ کوالی فائڈ ہے کہ انگریزی ہندی اور اردو میں سے کوئی زبان نہیں جانتا اس لئے کبھی میرے لیٹر بکس میں میرے نام کی جگہ مسٹر خان شور کے نام کا خط پڑا ملتا ہے، اور کبھی پربھودیال کے نام کا۔ البتہ میرے نام کے جو خطوط ہوتے

ہیں وہ بیشتر حلوائیوں، بنیوں اور سبزی فروشوں یا کسی اردو دان حجام کے ذریعہ وصول ہوتے ہیں، اور وہ بھی کبھی کبھی۔ میری دانست میں ڈاکیہ صورت دیکھ کر خطوط بانٹتا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ آدمی غلام ہو مگر غلام صورت نہ ہو۔ یہ تو آپ کے پتہ سرزدہ کارڈ کی شان نزول تھی، اب آمدم برسر مطلب۔ لکھنؤ میں ایک صاحب ہیں جو میرے قریب ترین دوستوں میں ہیں، انہوں نے "قدمچے" پر ایسا ریویو کہا کہ اسے گوڈ سے بھی ایک ہاتھ بڑھا دیا اور میری اتنی تعریف پورے دو کالموں میں کی کہ میرا بے اختیار دل چاہا کہ میں کچھ نہیں تو اپنی نبوت کا اعلان تو کر ہی دوں۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا اور اپنی بیوی کے ہمراہ کہا کہ جی ہاں پڑھا اور پورے دو کالم بھر پڑھا اور اب تک بقید حیات ہوں۔ اگر کئی ہارس پاور کا بے غیرت نہ ہوتا تو آج آپ میرے تیجے میں شرکت کا شرف حاصل کرتے دکھائی دیتے۔ لہٰذا اب اندیشہ پیدا ہوگیا کہ کہیں میرے مرنے کے بعد اسے الہامی کتاب نہ مان لیا جائے، اور میرا حشر بھی اس واحد پیغمبر کے ساتھ ہو جسے دنیا والوں نے بھیجا تھا۔ اور اس طرح مرنے کے بعد آپ نے میری بخشش کی راہ میں ایسے ہمالیہ پہاڑ کھڑے کر دئے ہیں، کہ میں دمہ کا مریض ہونے کے سبب اس کی ایک چٹان بھی پھاند نہیں سکتا۔ ریویو کے معنی غالب کے مداح بجنوری بن جانے کے نہیں ہیں۔ میں تو اپنی کتاب کے ذریعہ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں پر نگاہ کرنا چاہتا تھا، اور آپ نے بلا سبب مجھے پیغمبر بنا دیا جبکہ میں نے آپ یا آپ کے خاندان والوں کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچایا تھا۔ میں نے تو خالی الذہن ہو کر ایک گھنٹہ سینکڑہ کی رفتار سے یہ نظمیں امیر حسن نورانی صاحب کے سامنے ایک صاحب کو مول دی تھیں لہٰذا جیسا کہ آپ نے لکھا ممکن ہے کہ ان میں کچھ نظموں میں رواروی میں معنی و مطالب کی خامیاں پیدا ہوگئی ہوں تو حضور والا میں بھی آخر انسان ہوں۔ مجھ سے غلطیاں ہوسکتی ہیں۔ میں چاہوں گا کہ ان تمام خامیوں کی طرف بھرپور اشارہ کرتے ہوئے آپ اس پر ریویو کردیں۔

آپ نے میری دوسری کتاب پر جو ریویو کیا تھا وہ مجھے بے حد پسند آیا، اگر آپ اس کتاب پر ریویو نہ کریں گے تو جس طرح اس دور میں غذا کا بیشتر حصہ بنیوں کی نذر ہو گیا ہے اسی طرح یہ کتاب ان کے یہاں بھی ایک اضافہ کی شکل اختیار کر کے خود واصل بہ جہنم ہو جائے گی۔ اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو : سر دوستاں سلامت!

سنا ہے کہ غریبا مئو پانچ سو روپے آپ سے نکال چکا ہے۔ ہائے وہ بھی غریب کیا کرے، کوئی نہ کوئی کام تو ہر شخص کو کرنا ہی چاہیے۔ اب اگر اس غریب الوطن نے کشمیر میں بیٹھے بیٹھے حیات اللہ اور مقبول احمد لاری کی دموں پر پیر رکھ دیا تو کیا گناہ کیا؟ وہ بھی تو آخر کمال احمد صدیقی ہے۔ پھر جبکہ:

ع این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند!

(دلی، ۲۸/اکتوبر، ۷۲ء)

☆

حضور والا! یہ آپ نے تڑپانے اور گوبر سنگھا سنگھا کر مار ڈالنے کا ڈھنگ اور آداب اہل شام سے سیکھے ہیں یا اہل لکھنؤ سے، جہاں ایک زمانہ تک آپ مقیم رہ چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں تاخیر پسندی آپ کی طبیعت میں دخیل ہوگئی ہو۔ کیوں کہ ہمارے لکھنؤ میں کچھ مسلمان افطار میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں اور جب تک دن کی روشنی میں بدن کے رونگٹے دکھائی دیتے ہیں منہ تک ایک کھیل نہیں لے جاتے، خواہ گرد و پیش دنیا کے فواکہات کے انبار ہی کیوں نہ لگے ہوں اور ان میں سے ہر

مشروب اور غیر مشروب شے چلا چلا کر کہہ رہی ہو کہ خون حسینؑ کا واسطہ مجھے کھانے میں تاخیر سے کام نہ لیجئے، مگر کیا مجال کہ وقت مقررہ سے پہلے نگاہ اس طرف اٹھ جائے۔ اس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے کہ جب آپ کا جواب آیا تو ضبط وانتظار کی ڈوری میرے ہاتھ سے چھوٹنے والی ہی تھی، اور جواب کی ساری امیدیں پامالِ ستم اسپان ہو چکی تھیں، کہ بہرصورت آپ کا کارڈ موصول ہوا، جس کا متن ''شملہ اگری منٹ'' جیسا مصلحت آمیز اور مصالحت پرور تھا۔ خط پڑھ کر مرزا ہادی رسوا مرحوم کی ایک رباعی کے چار مصرعے آنکھوں کے سامنے کھنچنے لگے:

حسرت دید رہی جاتی ہے
دل کی امید رہی جاتی ہے
ان کو انکار گلے ملنے سے
یاں مری عید رہی جاتی ہے

مجھے اب یقین کامل ہے کہ آپ میری کتاب پر ریویو کر کے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑتے ڈرتے ہیں، اور اسی لئے اپنی ادبی شرع کی روشنی میں آپ نے میری کتاب میں ایک ایسا ادبی سقم نکالا ہے جس کا جواز میرے پاس نہیں۔ پھر بھی آرزو لکھنوی کا یہ شعر بڑی دیر تک میرے دماغ کو ٹہوکا دیتا رہا:

دوست نے دل کو توڑ کر نقش وفا مٹا دیا
سمجھے تھے ہم جسے خلیل کعبہ اسی نے ڈھا دیا

میرے لئے خودکشی کرنے اور اناالحق کہہ کر سولی پر چڑھ جانے کا مقام نہیں تو اور کیا ہے، کہ میری ہرارنی کا جواب لن ترانی میں ملے۔

یہ خط بڑی سنجیدگی سے ناراض ہو کر آپ کو لکھ رہا ہوں کیوں کہ آپ چاہتے ہیں کہ اس معمولی قدمچے پر آپ سے ریویو لکھوانے میں میرے ڈاک کے مصارف کموڈ سے بڑھ جائیں۔ آپ کو اتنی بلندی پر بیٹھ کر اس کا اندازہ چاہے ہو یا نہ ہو مگر پھر بھی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے بھارت کی راجدھانی میں گرانی نے اندرا رانی جیسا عہدہ سنبھال رکھا ہے۔ میرے پاس اتنے پیسے کہاں کہ روز روز آپ کو خط لکھ کر آپ کا وقت ضائع کروں، اس ''سستی گرانی'' کا اندازہ آپ اس سے بھی کریں گے کہ شکر ساڑھے چار اور پانچ روپے کلو تک پہنچ گئی ہے۔ جبکہ صرف یہی ایک شے دنیا میں میری سب سے بڑی کمزوری رہی ہے۔ اب آپ اس گرانی میں اگر کسی شکر خورے کو شکر نہیں دیتے تو اس موذی کو ایک ٹکڑے ہی سے نواز دیجئے۔ آپ کشمیر جنت نظیر کی بلندی سے ہم خاکساروں کو دیکھ رہے ہیں، جبکہ میں پہلے سے چلا رہا ہوں کہ ع خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر!

دوسرا مصرعہ سوئے ادب ہے اس لئے نہیں لکھتا۔ یقین کیجئے کہ اس ۶۲ سال کی عمر میں میں نے ایسا ''رستم شکن'' دور نہیں دیکھا جہاں ترقی پسند جدیدیوں سے اس طرح ڈرتے ہوں جس طرح آج کل کی پولیس طلبہ سے ڈرتی ہے۔ کیا قیامت ہے:

ع جو بہنوئی تھے اب وہ سالے ہوئے!

اپنے نام سے ریویو کرتے عزت سادات خطرہ میں پڑ جانے کا اگر آپ کو اندیشہ محسوس ہو رہا ہو تو آپ کی جھولی میں تو کمال احمد صدیقی جیسے اہل کمال پڑے ہوئے ہیں، انہیں سے لکھوا دیجئے۔ اس سے یہ ہوگا کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ جدیدیے آپ پر ویسا وار کرنے سے رہے جیسا کہ انہوں نے پروفیسر احتشام حسین اور اختر اورینوی پر کیا ہے۔ یہ دونوں بیچارے بیویوں سے بھی بدتر قسم کے میاں ہیں۔ ''چپ کی داد'' کے عنوان سے جو نظم لکھی گئی وہ غالباً انہیں دونوں کو سامنے بٹھا کر لکھی گئی ہے۔

ع اے ماؤ، بہنو، بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے

غالباً برنارڈ شا نے انہیں دونوں کو دیکھ کر کہا تھا:

It is dangerous, to be too good.

مگر آپ کا معاملہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ اور بجائے عیسائیت کے اصول پر عامل ہونے کے، آپ اسلامی اصول پر عامل ہیں، جہاں عفو کی منزل ختم ہونے کے بعد مکے کا جواب مکّے سے دیا جاتا ہے۔

پھر حضور والا! میں کہتا ہوں کہ جب بکرا خود چھری مانگ رہا ہے تو آپ کو اللہ اکبر کرنے میں کیا تامل ہے، اور آپ تو اپنے بچے کے عقیقے کے موقع پر ہاتھ سے ایک جوان جہاں بکرا آنکھ بند کرکے ذبح کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے چھری پھیرنے میں کوئی حضرت اسمٰعیل کا درجہ تو حاصل نہیں لوں گا، میں اپنے نام کے سہارے پیغمبر جیسا (غلام احمد) چلا آرہا ہوں ویسے کا ویسا ہی رہوں گا۔ خدا جانتا ہے اگر آپ جھٹکا بھی کر دیں گے تو میں اپنے آپ کو جنتی تصور کروں گا۔ میں تو اچھی بری چند سطریں چاہتا ہوں اور وہ بھی اس وجہ سے کہ :

ع کچھ تڑپنے سے بہلتی ہے طبیعت میری۔

(دلّی، ۱۶/ نومبر ۷۲ء)

●

کیوں حضور!

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

میں نے جدید ادب پر ''قد مچے'' کے عنوان سے ایک کتاب عصری ادب میں ریویو کے لئے اس وقت دی تھی، جب میں جوان تھا۔ مجھے توقع تھی کہ آپ میری زندگی ہی میں اس پر ریویو کر دیں گے۔ اب ۶۲ ء کی لپیٹ میں ہوں کسی وقت بھی دمہ کے دورے عالم بالا کا دورہ بن سکتے ہیں، آج کل اسی شدت کے دورے پڑ رہے ہیں، جس شدت سے راجدھانی میں طلبہ سرکاری بسوں کو نذر آتش کر رہے ہیں۔

میری دانست میں آپ نے کتاب کا گرد پوش دیکھ کر اس پر ریویو کرنا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ مولانا فروغ اردو نے کسی جھلی والے کو سات نمبر کی بیڑی کا ایک بنڈل دے کر اور خود کو ایک کموڈ پر بیٹھا کر اپنا پوز کھنچوالیا ہے جو ابھی تک کسی فوٹو گرافر کی زد سے بچ رہا تھا، اور اسے میری کتاب کا گرد پوش قرار دیا ہے، کاش آپ نے اس کا مقدمہ ہی پڑھ کر اس پر چند سطریں لکھ دی ہوتیں۔ آپ سے تو اب اس دنیا میں ملاقات کی کوئی امید نہیں کیوں کہ میں بالکل پابہ رکاب ہوں۔ جب تک علی جواد سری نگر میں تھے مجھ کو پابندی سے مشاعروں میں بلالیا جاتا تھا۔ مگر اب وہاں کے زمین وآسماں بدل چکے ہیں لہذا:

کون سنتا ہے فغانِ درویش قہر درویش بہ جانِ درویش

۲۷/ ستمبر کو اردو مجلس سے میری آواز سن لیجئے گا۔ ذکر عیش نصف عیش۔ کمال احمد صدیقی نے سنا ہے کہ پانچ سو روپے کی کتاب لکھ کر حیات اللہ انصاری کی دم پر پیر رکھ دیا۔ بڑی ذہانت سے کام لیا، غالب کا قلم دوات اور کاغذ اب تک غالب اکیڈمی اور ایوان غالب کو میسر نہ آیا، مگر کمال نے ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر دریافت کر لی۔ اگر فرشتوں کی فروگذاشت سے وہ بجائے ہندستان کے پاکستان میں پیدا ہو لیا ہوتا تو اگر کچھ نہیں تو پنجاب والے اسے پیغمبر تو مان ہی لیتے۔ کمال سے ۱۵/ اگست کو لال قلعہ کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے غالب کے جو اشعار کہے ہیں وہ بھی سننے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالکل اصل سے ملا دیا ہے۔

دلی، ۲۵/ ستمبر ۷۳ء

ذرا سوچیں... کیوں ہوئے خار جہاں میں امروز!

اخلاق احمد آہن

ہم یہودیوں اور صہیونیوں کو لعن طعن اور گالیاں دیتے نہیں تھکتے اور یہ رویہ عالم اسلام میں یکساں طور پر عام ہے۔ میرا مقصد مسلمانوں کو ان کے اس جمہوری حق سے باز رکھنا نہیں اور نہ ہی یہ کہ پوری دنیا میں یہودیوں کی سازشوں کے سبب پھیلے خرافات اور اندھیر گردی کا دفاع کرنا ہے۔ لیکن کیا ہم نے کبھی ٹھنڈے دل سے اس قضیے کے بارے میں کبھی سوچا بھی ہے کہ کیوں مٹھی بھر یہودی قوم دنیا اور کاروبارِ دنیا کو اپنے عزائم اور اپنے پروگراموں کی تکمیل کے لیے بڑے دھڑلے سے استعمال کر رہی ہے اور دنیا بھی ان کے سامنے کورنش بجالاتی نظر آرہی ہے۔ دنیا میں ان کی آبادی اتنی ہی ہے جتنی ہمارے کسی بڑے شہر میں رہنے والے باشندوں کی، لیکن سچ یہ ہے کہ ہزاروں بھیڑوں کے گلہ کے لیے ایک چرواہا کافی ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی حالت بھیڑ کے گلوں سے بہت ملتی جلتی ہے۔ جدھر ہانک دیا، چل پڑے۔ نہ سوچا، نہ سمجھا اور نہ اس کی صلاحیت پیدا کی۔ زندگی کا نہ کوئی نصب العین، نہ حالات سے آگاہی، نہ ماضی کی خبر، نہ حال سے آشنائی۔ پیٹ بھرا اور اللہ کا نام لیکر ڈکار لے لیا اور بس سمجھ لیا کہ دنیاداری بھی نبھ گئی اور دین کا حق ادا ہو گیا۔

بغور دیکھیں اور تھوڑی زحمت کر کے تاریخ کے اوراق پلٹیں تو پائیں گے کہ یہودیوں کے حالات ہمیشہ ناگفتہ بہ رہے ہیں۔ ہمیشہ مختلف قوموں اور خاص طور سے اہل مغرب کے نشانے پر رہے۔ نشانے پر مسلمان بھی تھے، لیکن انھوں نے ان تمام حملوں کو ناکارہ ثابت کر دیا۔ یہ خطرات آج بھی ہیں اور مجموعی طور پر مسلمانوں سے زیادہ یہودیوں کو ہیں اور اسی سبب ان دونوں قوموں میں فی زمانہ ایک نفسیاتی مشابہت بھی پائی جاتی ہے اور وہ ہے: انسیکیوریٹی یا احساس خطر۔

یہیں پر سوچنے کی ضرورت ہے، اس فرق کو سمجھنے، تجزیہ کرنے، جائزہ لینے اور امراض ملی کی صحیح تشخیص اور اسکے مداوا کی ضرورت ہے۔ بہت سارے سوالات اٹھانے اور ان کے جوابات ڈھونڈنے کی ضرورت ہے اور وقت کے ان اہم ضرورتوں کے ساتھ بہت اہم ضرورت ہے ان پر عمل کرنے اور عمل کرانے کی۔

ذرا سوچیں کہ آخر صدیوں تک معتوب رہی یہودی قوم جسے بخت نصر سے لیکر ہٹلر تک صرف عتاب دنیا کا سامنا رہا، جس کی آبادی حقیر، قدرتی وسائل محدود اور جغرافیہ مسدود ہے، وہ نہ صرف یہ کہ آج خود ہر لحاظ سے مضبوط ہے اور نظام سیاست کا قطب اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے ہے، بلکہ گذشتہ صدیوں پر نگاہ ڈالیں تو تمام ناہمواریوں کے باوجود ایسے نابغہ ہائے روزگار پیدا کرنے میں کامیاب رہی ہے، جنہوں نے عالمی سیاست و

حکمت کو تہہ وبالا کر دیا۔ مثلاً ڈارون، مارکس اور آئینسٹائین کا ہی نام لے لیں۔...اور آج تو سب کچھ انھیں کے ہاتھوں میں، انھیں کے سہارے اور انہیں کے اشارے پر چلتا ہے اور دنیا کا سب سے طاقتور ملک امریکہ کی نظام سیاست ومعیشت تو جیسے ان کی لونڈی ہے یا یرغمال۔ خواہ ہالی ووڈ ہو یا نیوز ایجنسی، نیوز چینل ہوں یا بڑے سے بڑا اخبار، امریکی معیشت پر قابض بڑی بڑی کمپنیاں ہوں یا بینک کا نظام یا سیاست وحکومت کی پر پیچ گلیوں پر مسلط پالیسی ساز ادارے ہوں یا دانشور۔ ہر جگہ انھیں کا راج ہے اور ہر مقام پر انھیں کا سحر۔ ....اور جب یہ سحر سپر پاور پر اس قدر حاوی ہے تو اس کے جادو سے باقی دنیا کیونکر اچھوتی رہ سکتی ہے۔ آپ اگر نگاہ اٹھانے کی زحمت کریں تو دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے اردگرد، آس پڑوس، آگے پیچھے ان کی کرشمہ سازیوں کی جلوہ نمائیاں ہیں۔

دوسری طرف مسلمان ہیں۔ صدیوں متمدن دنیا پر حکومت کی، تمام علوم دنیا جمع کر لئے، ساری طاقتوں کو شکست دے دی، ساری سازشوں کو ناکام کر دیا اور تمام براعظموں پر پھیل گئے۔ چلئے یہ بات تھوڑی پرانی ہوگئی۔ لیکن اب بھی کیا کمی ہے؟ پچاس سے زیادہ ممالک، ایک ارب سے بیشتر آبادی، جکارتا سے رباط تک پھیلاؤ، تیل اور معدنیات کے لامحدود ذخائر اور دلیر وجفاکش وذہین ترین اقوام پر مشتمل ہے آج بھی اسلامی دنیا۔ پھر بھی مقہور، پھر بھی مردود۔ وسائل رکھ کے بھی بھکاری اور حکومت رکھ کے بھی دربدر۔ تہذیبیں سینچ کر بھی شناخت کی جستجو میں سرگرداں اور ملکوں کو بنا کر بھی احساس بے وطنی کے شکار۔ اقراء پڑھ کے بھی ناخواندہ اور لاتقنطو کا ورد کر کے بھی مایوسی کے مریض۔

سوال اٹھتا ہے، آخر ایسا کیوں؟ یہودی....محدود وسائل اور نفرت وقہر کا شکار رہ کر بھی حکومت ومعیشت، علوم وحکمت، ذرائع رسل ورسائل کے ناخدا، دنیا کی قوموں کی تقدیریں بدلنے والے فیصلوں میں ان کا رول، بدلتے زمانے کے نبض پر ان کا ہاتھ اور دنیا کے بیشتر طاقتور ہاتھوں کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ۔ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی خبر سے باخبر اور ہر چھوٹے بڑے دوست دشمن سے آشنا۔ صدرِ اسلام میں بیٹھ کر عالم اسلام کا شیرازہ بکھیرنے میں مصروف اور... مسلمان....اپنے ہی کچھار میں مجبور ومحصور، سب کچھ رکھ کر قلاش، بے کس، بے بس، بے سہارے، بے چارے، قسمت کے مارے، بے فرہنگ وبے تمدن۔ ہر جا نفریں اور دھتکار۔ یہ خواہ پرانی دلی کے کوچہ میں بیٹھے ہوں یا لاہور کے چوراہے پر، لندن کی سڑکوں پر ٹہل رہے ہوں یا پیرس کے کلبوں میں پڑے ہوں، قندھار میں ہوں یا کربلا میں، تہران میں ہوں یا قاہرہ میں، بیروت میں ہوں یا انقرہ میں۔ غرضکہ کرۂ ارض کے اس کونے سے لیکر اس کونے تک نظر دوڑا جائیے، کم وبیش یہی حالت اور یہی نفسانفسی۔ ہر خبر میں مسلمان اور ہر مسلمان کی تضحیک۔

وجہ صاف ہے، لیکن ہم بے خبر، مطلع بھی صاف ہے لیکن قصور نظروں کا ہے جو اٹھتی ہی نہیں اپنی تنگ وتاریک گلیوں سے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا کہ دونوں قومیں احساس خطر کا شکار ہیں لیکن دونوں کا ردعمل مختلف ہے۔ ایک کا ردعمل کامیابی کی اونچائیوں تک لے جاتا ہے اور دوسرے کا پسماندگی کے غار میں، کیونکہ ایک لاتقنطو کو مانتا ہے اور دوسرا صرف اس کا ورد کرتا ہے لیکن عملاً تقنطو پر عمل پیرا ہے۔ جو رہبانیت کے پیروکار تھے، وہ توکل کے اسلامی تصور کو مانتے ہیں یعنی اولیت عمل کو، فعالیت کو، جہاد زندگی کو اور جن کا تصور عمل پیہم تھا وہ انھیں اصولوں پر جینے

مرنے والوں کے مزاروں پر مکھیاں مارنے کو توکل سمجھ بیٹھے۔ اپنی بے عملی، تساہل، جہالت، لاعلمی، جمود، فقر، غربت، بے وقعتی اور ذلت، غرض کہ اپنی نادانی اور حماقت کو بھی خدا کی مشیت گردان کے کسی معجزہ کے انتظار میں منتظر فردا ہیں یہ مسلمان!...تو پھر قرآن کی اس آیت کا کیا ہوگا، جس کا مفہوم اقبال نے کچھ یوں بیان کیا تھا کہ:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ہمارا دین اور ہماری سمجھ، ہماری روحانیت اور ایمانی قوت، چند ڈھکوسلوں اور خرافات تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہماری دینی شناخت کرتے، پاجامے میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ پانچ سو سال پرانے منطق وفلسفہ کی گردان کر کر کے اسے دینی فلسفہ کا درجہ دے چکے ہیں اور اپنے عہد کے تقاضوں، ایجادوں، فکر وفلسفہ کو سمجھنے سے گریزاں ہیں۔ ملت دو طبقوں میں بٹ گئی ہے۔ 'علمائے دین' 'دنیاوی دانشوروں' کو فاسق وفاجر سے کم درجہ دینے پر آمادہ نہیں اور یہ 'روشن فکر دنیاوی دانشور'، 'دقیانوسی علمائے دین' کو اچھوت سے زیادہ ارفع مقام نہ دینے پر بضد ہیں اور حق یہ ہے کہ دونوں عموماً غلط فہمیوں اور جہل مرکب کا شکار۔ افہام وتفہیم کے بجائے تخریب وتقسیم ہمارا مذہب بن چکا ہے۔ ہم ہر چیز کو تقسیم کرنے پر آمادہ ہیں، اس لئے ہر جگہ تخریب کا شکار اور المیہ تو یہ ہے کہ تقسیم کا یہ سارا عمل دین کے نام پر ہو رہا ہے۔ خلافت کی تقسیم، مملکتوں کی تقسیم، پھر گروہوں کی تقسیم، غرض کہ تقسیم کا یہ سلسلہ بڑھ کر زندگی تک پہنچ گیا ہے۔ اب زندگی دنیاوی اور دینی زندگی میں تقسیم ہوگئی ہے اور یہی نہیں اسی طرح انھیں خطوط پر علم بھی تقسیم ہو گیا ہے۔ اسی سبب ایک طبقہ دین کے نام پر اندھیروں میں گم ہے اور دوسرا دنیا کے نام پر ظلمتوں میں غرق۔ جس مذہب نے دنیا کے امور کو بھی دین کا حصہ بنایا، وہاں آج رہبانیت کا بیٹھا زہر دین تصور کیا جا رہا ہے، جس مذہب نے کائنات کی اسرار کشائی کا حکم دیا، وہاں آج جہالت کی حکمرانی ہے۔ جو مذہب دنیا کے ہر خطے، قوم، زبان، فرقے کو گلے لگانے آیا تھا، وہاں انھیں بنیادوں پر کشت وخون کا بازار گرم ہے۔ جس مذہب نے اخلاق کی درستگی، پاکی وصفائی کو دین کی اساس بتایا، اسی کے پیروکار بداخلاقی، گندگی اور ناپاکی کے مبلغ ہیں۔ جو رواداری کا نمونہ تھے، وہ ہر بات پر قتال پر آمادہ ہیں۔ جس مذہب نے اوہام وخرافات کے طوفانوں کو زیر کیا، اسی کے ماننے والے اوہام وخرافات کے مقلد ہیں۔ جس نے مختلف قوموں کو ایک پہچان دی، وہی آج اپنی شناخت سے نابلد ہے۔ اپنا احتساب جن کا شیوہ تھا، وہ اپنی ہر ناکامی کے لئے یا تو دوسروں کو گالیاں دے کے مطمئن ہو جاتے ہیں یا پھر اسے مشیت ایزدی یعنی خدا پر الزام دھر کر اپنی ذمہ داریوں سے ہاتھ جھاڑ لیتے ہیں۔

ان سب پر المیہ یہ کہ سچ جاننے والے سچ بولنے سے گریزاں ہیں یا خوفزدہ۔ کچھ لوگ ہمت کرتے ہیں تو ہر چار دانگ سے اٹھ رہی بھانت بھانت کی آوازوں میں ان کی آواز گم ہو جاتی ہے۔ جن کی سنی جا سکتی ہے، وہ بولتے نہیں اور جو سننے یا سنانے لائق نہیں، ہر جگہ ان کی آوازیں سنائی پڑتی ہیں۔ جو سمجھتے ہیں، وہ ناسمجھوں سے دور ہیں اور جو ناسمجھ ہیں، انھیں سمجھنے کی نہ طلب ہے، نہ احساس۔ جو رہنما ہیں، انہیں عوام سے کوئی تعلق نہیں اور نہ عوام میں غلط رہنماؤں سے کنارہ کشی کا رویہ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سچ بولا جائے اور خوف وترس کی چادر اتار کر سچ بولنے والوں کی آواز میں آواز ملائی جائے۔ سچ کی

تلاش کی جائے اور اس پر عمل پیرا ہوا جائے۔صرف یہودیوں کو گالی دیکر یا شیطان پر الزام دھر کے یا توکل کا حوالہ دے کر ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ہمیں اپنے دن بدلنے کے لئے خود ہی ہاتھ پاؤں مارنے ہونگے، خود ہی تعلیم کی طرف بڑھنا ہوگا، خود ہی اپنی آواز اٹھانی ہوگی اور خود ہی اپنے وجود کا احساس دلانا ہوگا۔ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہر رواج دین نہیں ہوتا اور ہر اشاعت شدہ خبر سچی نہیں ہوتی اور یہ بھی کہ خدا کا نام لے لینے سے ہر عمل جائز نہیں ہو جاتا۔کامیاب وہی ہے، جو شکست کو فتح میں بدل دے۔اسی طرح ہر ڈگری یافتہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔تعلیم یافتہ وہی ہے، جو نہ صرف آگاہ ہے بلکہ اپنی ناآگاہیوں سے بھی واقف ہے اور اس کے حصول کے لئے کوشاں بھی۔

جب کہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہر روایت اور عادت کو بلا تحقیق وجستجو مذہب تصور کئے بیٹھے ہیں اور ہر نئی چیز کو فتنہ قرار دینے پر آمادہ، خواہ وہ سائنسی ایجاد وانکشاف انسانیت کے لئے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو۔مذہب کا راگ الاپتی ہر آواز پر بنا سوچے سمجھے لبیک کہہ اٹھتے ہیں۔جہاں ہیں، ڈرے، سہمے اور قنوطیت و ناامیدی کا شکار اور کچھ کرنے یا کسی عمل سے خود کو دور رکھے ہوئے اپنی اپنی قباؤں میں پنہاں۔تعلیم جو ان سب کا حل ہے، اس سے کوسوں دور اور نتیجتاً زندگی کے ہر شعبے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے بجائے، گریزاں اور کنارہ جو۔نفرتوں کا شکار اور اپنوں ہی سے دشمنی پر آمادہ اور تعصب ایسا کہ اپنا اگر غلط بھی ہو تو اس کے حامی۔یہ سب تباہی کے عناصر ہیں۔ایک دو ہی کچھ کم نہ تھے، یہاں تو سب کے سب ہیں۔

☆☆☆

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے اسباب وعوامل

ڈاکٹر محمد اجمل

آج جو سائنس اور عصری علم و دانش اہلِ مغرب کے لیے نقطۂ عروج سمجھی جارہی ہے اور جس نے مسلمانوں کی نظروں کو خیرہ کر کے انہیں احساسِ کمتری کا شکار بنادیا ہے، انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس برگ وبار کو ان کے اسلاف ہی نے کئی صدیوں تک اپنے خونِ جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا ہے۔ یہ سائنس جس کے ذرہ ذرہ سے دنیا آج لطف اندوز ہورہی ہے اور جو دیگر ضروریاتِ زندگی کی طرح انسانی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ اور جزء لاینجزیٰ بن چکی ہے، اس کی تخم ریزی ہمارے اجداد ہی نے بدستِ خویش کی تھی۔

سائنس کی دنیا میں اقوامِ عالم نے ہمارے ہی بزرگوں کی انگشت پکڑ کر چلنا سیکھا ہے۔ سائنس جس پر آج اہل مغرب کی اجارہ داری ہے یہ درحقیقت مسلم خانوادے کی چشم وچراغ ہے، اغیار کے گھرانے اس کے لیے بانجھ تھے۔ اہل یونان صرف اس کی تمنا ہی گوشۂ جگر میں پال سکتے تھے کیونکہ ان کے یہاں اس کی تخم پاشی کے لیے سرے سے عوامل ہی ناپید تھے اور یورپ میں حال یہ تھا کہ وہاں ایسی اولاد کی تمنا حاشیۂ خیال میں لانا بھی جرم تھا۔ اگر کوئی اس کی خواہش بھی کرتا تو کلیسا کی آگ میں جلا کر خاکستر کردیا جاتا۔ سائنس اپنے وجود کی بقا اور ترقی کے لیے قوم مسلم کی صدیوں تک مرہونِ منت رہی ہے، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کے گلی کوچوں میں کاسہ گدا گری وکشکول لیے تحقیقات اور انکشافات کی بھیک مانگتی رہی ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس آج وہ ہمارے لیے متاع گمشدہ ہے۔

جس وقت انگریزی استعماریت ہندوستان پہنچی کیا اس وقت ہندوستانی تعلیم یافتہ نہ تھے؟ اس وقت ہندوستان کو کیا سونے کی چڑیا یونہی کہا جاتا تھا؟ کیا یہ غیر تعلیم یافتہ افراد کے لئے ممکن ہے؟ تاج محل جیسا دنیا کا عجوبہ لال قلعہ جیسی شاہکار عمارت کے جھولتے مینار جیسی لاینحل ٹیکنالوجی دنیا کو فراہم کرنے والی قوم جاہل ہوسکتی ہے؟ پھر بھی ہندوستان جیسے عظیم ملک پر انگریز دھیرے دھیرے غالب آتے گئے۔ جبکہ بڑے فخر سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا میزائیل ٹیپو سلطان نے بنایا تھا۔ پھر انگریز غالب کیسے آگئے؟

اب جدید دور کو لے لیجیے۔ دنیا کی جاہل ترین قوم افغانیوں نے دنیا کی دو بڑی طاقتیں روس اور امریکہ کو کیسے چنے چبوائے ان دونوں سپر پاور کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا کہ ہر طرح کے اسلحہ سے لیس ملکوں کو ڈھیر کرنے کے لئے اتنے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ تاریخ سے اور بھی درجنوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ پھر قوموں کے غلبے کا یہ اصول صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ یہ دنیا کی دیگر قوموں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ سب سے موٹی مثال فارس، روم، یا قیصر وکسریٰ جو کہ اس وقت کی

عظیم طاقتیں تھیں ان کی تباہی مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائی ہے۔

اب آیئے اس تصور کو لیتے ہیں کہ تعلیم کا کوئی تعلق مال و دولت سے ہے۔ بچپن سے ہم دیکھتے آرہے ہیں کہ شہروں، گاؤں، قصبوں میں صاحب دولت وثروت عموماً جاہل مطلق ہوا کرتے ہیں۔ ''انگوٹھے چھاپ'' بڑے بڑے سیٹھ کہلاتے رہے ہیں۔ اور آج بھی دنیا کا سب سے زیادہ مالدار آدمی اور مائکروسوفٹ کا بانی اسکول کی چند کلاسیں ہی پڑھا ہوا ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ مالدار امبانی برادران ہیں۔ ان کے والد دھیرو بھائی امبانی خلیج عرب کے ایک ملک میں پٹرول پمپ پر کام کرتے تھے اور وہ صرف میٹرک پاس تھے۔ مکیش اور انل کو یہ دولت اپنے والد سے وراثت میں ملی ہے۔ اور ہم تو اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ رزق کی ذمے داری خدائے بزرگ و برتر نے لے رکھی ہے۔ اور پورے قرآن میں خدا نے یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ میں تعلیم یافتہ کو رزق دونگا اور جاہل کو نہ دونگا۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہیں کہا کہ میں انسان کو دوں گا جانور کو نہیں دوں گا! بلکہ کہا گیا ہے کہ ''اس روئے زمین پر رینگنے والے ہر جاندار کی روزی روٹی کی ذمہ داری میرے سر ہے۔''

اس سے بھی آگے بڑھ کر مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ یہ بھی ایک من گھڑت افسانہ ہے کہ تعلیم اور سائنس و ٹیکنالوجی کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہے۔ ابھی اوپر ہم نے تذکرہ کیا ہے کہ مائکروسوفٹ کا بانی چند کلاسیں پڑھا ہوا ہے۔ 19 ویں صدی کا سب سے بڑا موجد تھامس ایڈیسن بھی غیر تعلیم یافتہ تھا۔ یہی نہیں آج کی سائنس کی بنیاد رکھنے والے تمام کے تمام سائنس داں جن میں گنے چنے غیر مسلم بھی تھے کسی کالج، کسی یونیورسٹی، کسی انجینئرنگ کالج یا ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ سے سند یافتہ نہ تھے۔ پھر ان کی تعلیم کیا تھی؟ سب کے سب بشمول غیر مسلم قرآن، حدیث وفقہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ سائنس و ٹیکنالوجی کے لئے تعلیم کا افسانہ بھی بس افسانہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ جو وجود کائنات پر سوچتا ہے اور اللہ کی مخلوقات کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے وہ دنیا میں آگے بڑھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں سوچنے اور غور و فکر کرنے کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔

لہٰذا آج اگر عہدِ وسطیٰ کے مسلم دانشوروں اور سائنس دانوں کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہیں تو مغربی ممالک کے کتب خانوں اور لائبریریوں میں جانا ہوگا جہاں جابر بن حیان، ابنِ سینا، زکریا الرازی، البیرونی، الخوارزمی، الکندی، ابونصر الفارابی، ابنِ رشد، ابنِ زہر، ابنِ خلدون، ابومعشر، ابن الہیثم، اور نصر الدین الطوسی جیسے بے شمار مسلم سائنس دانوں کی تصنیفات، کتابیں، رسائل اور دیگر اسلامی لٹریچرز محفوظ ہیں۔

قرونِ وسطیٰ کے سائنسی علوم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں مسلمانوں نے اپنی خدمات انجام نہ دی ہوں اور ان میں سے اکثر انکشافات و ایجادات کو اہلِ مغرب سے منسوب نہ کیا گیا ہو۔ نئی دنیا کی دریافت کا سہرا اطالوی ملاح کرسٹوفر کولمبس کے سر باندھا جاتا ہے لیکن بعض انصاف پسند امریکی محققین کے نزدیک عرب کولمبس سے بہت پہلے امریکہ پہنچ گئے تھے۔ خون کی دورانیہ کی دریافت ابن النفیس نے کی ہے جبکہ اہلِ مغرب اس کا موجد مائیکل سرفیٹس اور ریلڈ و کولمبو کو ٹھہراتے ہیں، وقت کی پیمائش کے لیے پنڈولم کا استعمال سب سے پہلے ابن یونس نے کیا مگر اہلِ مغرب اسے گلیلیو کی دریافت بتاتے ہیں، کشش کا نظریہ مسلمانوں نے پیش کیا مگر اب اسے مغرب کی متاع دریافت کہا جاتا ہے۔

حیف صد حیف اہلِ مغرب پر جو مسلمانوں کے سائنسی

کارناموں کو تاریخ کے صفحوں سے کھرچ کھرچ کرنا پید کرنے میں کوشاں ہیں حالانکہ ابھی انہوں نے سائنسی دنیا میں صرف پانچ صدیاں گزاری ہیں جبکہ اس سے قبل مسلمانوں نے سائنسی میدان میں ایک ہزار سالہ انقلابی دور گزارا ہے۔

مگر افسوس پندرہویں صدی عیسوی میں اندلس میں مسلمانوں کے خلاف انکوزیشن جیسی مذہبی وبا پھیلا کر عیسائیوں کے ذریعہ مسلمانوں کا وہاں سے نکالا جانا، وسطِ ایشیا میں تاتاریوں کے مسلسل حملے، ہلاکو کے ذریعہ بغداد کی تباہی، بغداد، قاہرہ اور اسکندریہ میں موجود سیکڑوں لائبریریوں کا نذرِ آتش کیا جانا، مسلکی اختلافات کا پروان چڑھنا، یہ وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے مسلمان زوال کا شکار ہوگئے اور ان کی سیاسی، علمی، سائنسی ساری قوتیں مفلوج ہوکر رہ گئیں۔

دورِ حاضر میں سائنس کے میدان میں مسلمانوں کے اندر قدرے بیداری پیدا ہوئی ہے جو مسلمانوں کے حق میں حوصلہ افزا کہی جاسکتی ہے۔ بعض مسلم ممالک نے اپنی سرپرستی میں اس طرف توجہ دینی شروع کی ہے، یونیورسٹیوں میں باقاعدہ سائنٹفک لیبوریٹریز کا قیام اور ریسرچ کا کام بڑے پیمانے پہ شروع کیا جاچکا ہے، روز بروز مسلم ریسرچ اسکالرز، انجینئرز، ڈاکٹرز اور نوجوان سائنس دانوں کی ایک بڑی کھیپ تیار ہو رہی ہے جو مستقبل میں دنیا کے منظرنامے کو تبدیل کرنے میں بڑی مدد گار ثابت ہوگی۔ اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم اپنی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کے لیے دل وجان سے محنت کریں، اپنے اسلاف کے ذریعہ چھوڑے گئے علمی خزانوں سے اور دورِ جدید کے تجربوں سے استفادہ کریں اور دوسروں پر منحصر رہنے کے بجائے سائنسی میدان میں اہل اور خود مختار بنیں۔

☆☆☆

فہرست مخطوطاتِ مولانا آزاد لائبریری: تعارف و تجزیہ

ڈاکٹر عطا خورشید (علی گڑھ)

مولانا آزاد لائبریری کا قیام ۱۸۷۷ء میں اسٹریچی ہال کے متصل ایک ہال اور پانچ کمروں پر مشتمل عمارت میں ہوا۔ اس کا سنگ بنیاد اُس وقت کے وائسرائے ہند لارڈ لٹن کے ہاتھوں رکھوایا گیا اور اُنہی کے نام سے منسوب کرا سے ''لٹن لائبریری'' کا نام دیا گیا۔ یہ لائبریری سر سید اور اُن کے صاحبزادے سید محمود کے ذاتی ذخیرۂ کتب سے شروع ہوئی۔ سر سید کے ذخیرۂ کتب میں قدیم مطبوعات کے ساتھ ساتھ نادر مخطوطات بھی تھے مثلاً حمداللہ مستوفی قزوینی کی ''تاریخ گزیدہ'' کا وہ نسخہ جو شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں سے ایک ابوالفیض فیضی کے کتب خانے کی زینت بن چکا تھا اور جس پر فیضی کے دستخط نیز مہر ثبت ہے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی کی نادر عربی تصنیف ''تفہیمات الهیه'' کا واحد قلمی نسخہ بھی سر سید کی ہی بدولت اس لائبریری کو حاصل ہوا۔ سید محمود کے ذخیرے میں ابن سینا کی مشہور زمانہ عربی تصنیف ''القانون'' کا پہلا مطبوعہ نسخہ موجود ہے جو روم سے ۱۵۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کا مشہور فرانسیسی مستشرق اور عاشق اردو گارساں دتاسی کی تصنیف ''تاریخ زبان اردو'' کا وہ نسخہ بھی سید محمود کے ذخیرۂ کتب کے ذریعہ اس لائبریری کو حاصل ہوا جسے مصنف نے اپنے دستخط کے ساتھ سید محمود کو پیش کیا تھا۔

سر سید کے عطیہ کے بعد دیگر اشخاص بھی اپنا ذخیرۂ کتب اس لائبریری کو تحفۃً دینے لگے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں ایک بڑا ذخیرۂ کتب گورکھپور کے رئیس مولوی سبحان اللہ خاں نے دیا جس میں قدیم مطبوعات کے ساتھ ساتھ ۲۳۵۱ عربی، فارسی و اردو مخطوطات بھی شامل تھے۔ اسی ذخیرے سے وہ نادر الوجود شہ پارہ بھی لائبریری کو حاصل ہوا جس کی موجودگی پر مولانا آزاد لائبریری کو فخر ہے۔ میری مراد حضرت علیؓ کے دست مبارک سے چرم آہو پر خط کوفی میں لکھا قرآن کا وہ نسخہ ہے جو اپنی قدامت اور نفاست کے سبب اس لائبریری کا نادر ترین نسخہ ہے۔ ۱۹۳۰ء میں رامپور کے عبدالسلام خاں نے اپنا ذخیرۂ کتب اس لائبریری کو ہدیہ کیا۔ مطبوعات کے علاوہ اس ذخیرے میں ۵۶۶/عربی، فارسی و اردو مخطوطات کی ایک بڑی تعداد بھی موجود ہے۔ یہ ذخیرہ اپنے معطی (عبدالسلام خاں) کے مزاج کے حسب حال ہے یعنی تاریخ، بالخصوص تاریخ افغانان و روہیلان پر مبنی یہ ایک وقیع ذخیرہ ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جہانگیر آباد (بلند شہر) کے رہنے والے، مرزا غالب کے ہم عصر نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کا ذاتی کتب خانہ ان کے جانشین اور پوتے اور علی گڑھ تحریک کے ایک فعال کارکن نواب محمد اسمٰعیل خاں نے لٹن لائبریری کو ہبہ کر دیا اور اُن کی خواہش پر اس کلکشن کا نام ''شیفتہ کلکشن'' رکھا گیا۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ چونکہ خود شاعر اور تذکرہ نگار تھے اس لیے انہی موضوعات پر زیادہ

کتابیں جمع کیں۔ ان کے ذخیرے پر بھی اُن کے ذاتی شوق کی چھاپ موجود ہے۔ ۱۹۴۰ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر شاہ محمد سلیمان نے اپنی حیات اور دورِ وائس چانسلری میں اپنا ذاتی کتب خانہ، جو مطبوعات کے علاوہ ۱۴۱۴ر مخطوطات پر مبنی تھا، یونیورسٹی کی لائبریری کو عطیہ کردیا تھا۔ احسن مارہروی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک تھے۔ ۱۹۴۰ء میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے بعد ۱۹۴۱ء میں اُن کا ذاتی کتب خانہ جو مطبوعات و مخطوطات پر مشتمل تھا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں منتقل کردیا گیا۔ اس ذخیرے میں ۷۴۴ر مخطوطات ہیں، جو ''احسن مارہروی کلکشن'' کے نام سے موسوم ہیں۔ فرنگی محل (لکھنؤ) کے ایک بڑے مذہبی عالم عبدالحیٔ فرنگی محلی کا کتب خانہ بھی اُن کے نواسے ڈاکٹر مہدی انصاری صاحب نے ۱۹۵۷ء میں اس لائبریری کو عطا کردیا۔ عبدالحیٔ فرنگی محلی انیسویں صدی کے سربرآوردہ ہندوستانی علما میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ عربی کے ایک بڑے عالم اور کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ آپ کا ذخیرۂ کتب تقریباً ڈیڑھ ہزار بیش بہا، نادر و کمیاب عربی مخطوطات پر مشتمل ہے۔ ان کے مزاج کے مطابق اس میں مذہبیات پر مبنی مخطوطات کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ ۱۹۶۰ء میں غازیپور کے رئیس شاہ منیر عالم کا ۱۸۹ر عربی، فارسی و اردو مخطوطات پر مبنی ذاتی ذخیرہ مولانا آزاد لائبریری منتقل ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں ہی مولانا ابوالکلام آزاد کے صدیق مکرم نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا ذاتی ذخیرہ آپ کے صاحبزادے الحاج عبدالرحمٰن خاں شروانی نے مولانا آزاد لائبریری کو ہدیہ کردیا۔ یہ ذخیرہ ساڑھے پانچ ہزار مطبوعات اور ڈھائی ہزار مخطوطات پر مشتمل ہے۔ اس ذخیرے کا ہر ایک مخطوطہ لائبریری کے لیے دُرِ نایاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ بادشاہوں اور امراء کے کتب خانوں کے نسخے اس ذخیرے کی اہمیت کو دوبالا کرتے ہیں۔ مخطوطات کے علاوہ اس ذخیرے میں نمائشی اشیاء کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے مثلاً جہانگیری دربار کا نادرالعصر مصور منصور نقاش کی بنائی ہوئی پینٹنگ، اورنگزیب عالمگیر کی تلوار (ظفر تکیہ) وغیرہ اس ذخیرے کو نادرالوجود ثابت کرتی ہیں۔

ان ذخیروں کے علاوہ درج ذیل ذخائر بھی مولانا آزاد لائبریری کی زینت ہیں: آفتاب کلکشن (صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا ذخیرۂ مخطوطات)، جواہر میوزیم کلکشن (اٹاوہ)، قطب الدین کلکشن (اناؤ) اور طبیہ کالج کلکشن (اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ کا ۳۰۴ عربی، فارسی و اردو مخطوطات پر مبنی ذخیرہ، جو ۲۰۱۰ء میں مولانا آزاد لائبریری منتقل ہوا)۔ مولانا آزاد لائبریری میں مخطوطات پر مبنی ذخیروں کے معطیان کی تعداد بارہ ہے اور یہ ذخائر معطیان کے نام سے ہی منسوب کیے گئے ہیں۔ جو ذخیرے بھی لائبریری میں آتے تھے فوری اسکالرز کے استفادے کے لیے ان کی ایک یک سطری فہرست بنادی جاتی تھی۔ اس فہرست میں کوئی تحقیق یا جانفشانی نہیں کی جاتی تھی۔ سرسید کے عطیہ کردہ ذخیرے کو ''یونیورسٹی کلکشن'' کا نام دیا گیا۔ اس میں انفرادی طور پر عطیہ کردہ نسخے نیز خرید کردہ نسخوں کو رکھا جاتا ہے۔ ۱۸۷۷ء سے آغاز شدہ اس کلکشن میں ابھی بھی اضافہ جاری ہے۔ آج کی تاریخ تک اس ذخیرے میں ۴۱۲۳ مخطوطات (۹۱۷ عربی، ۲۳۸۳ فارسی اور ۸۲۳ر اردو) موجود ہیں۔ ذیل میں مولانا آزاد لائبریری کے مخطوطات کی اُن فہارس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے جو مختلف اوقات میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ذیل میں ان کی ترتیب اُن کی اشاعت کی تاریخ کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔

(۱) ۱۹۲۷ء میں سب سے پہلا ذخیرہ گورکھپور کے رئیس اعظم سید سبحان اللہ خاں کا اس کتاب خانے میں آیا اس میں ۲۲۱۹ر عربی، فارسی وارد و مخطوطات ہیں۔ ان مخطوطات کی ایک یک سطری فہرست سید کامل حسین نے تیار کی جو ۱۹۳۰ء میں مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ اس مطبوعہ فہرست میں ۱۸۳۲ رنسخوں کی موضوعاتی یک سطری تفصیلات درج ہیں۔ موضوعات کی تقسیم Dewy Decimal Clasification کے تحت کی گئی ہے۔ ۳۸۷ رمخطوطات اس مطبوعہ فہرست میں شامل ہونے سے رہ گئے جو ''ضمیمہ'' کے عنوان سے بعد میں شائع کیے جاتے لیکن بوجوہ شائع نہ ہوسکے۔ ضمیمہ والی یہ فہرست قلمی صورت میں آج بھی مولانا آزاد لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں اسکالر کے استفادے کے لیے موجود ہے۔

(۲) ۱۹۳۲ء میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا کتب خانہ، اُن کے پوتے نواب محمد اسمٰعیل خاں خلف نواب محمد اسحاق خاں نے لٹن لائبریری (موجودہ مولانا آزاد لائبریری) کو ہبہ کردیا۔ اُس وقت کے اعزازی لائبریرین پروفیسر محمد حبیب کی ایماء و خواہش پر ابوبکر محمد شیث صاحب، ناظم دینیات، مسلم یونیورسٹی نے ان مخطوطات کی ایک یک سطری موضوعاتی فہرست بعنوان ''فہرست کتب عطیہ نواب محمد اسماعیل خاں صاحب خلف نواب محمد اسحاق خاں صاحب'' تیار کی۔ چھوٹی تقطیع کے ۳۱ صفحات پر مشتمل یہ فہرست مطبع مسلم یونیورسٹی سے شائع ہوئی۔ اس فہرست میں ۱۶۹ راہم و نادر عربی و فارسی مخطوطات کا ذکر کیا ہے۔ کیفیت کے خانے میں سبھی نسخے کی یک سطری وضاحت بھی کی گئی ہے۔

(۳) حکیم سید شمس اللہ قادری نے مئی ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ کے قصبہ حبیب گنج کا دورہ کیا اور پانچ روز وہاں قیام کیا۔ اس قیام کے دوران انھوں نے نواب صدر یار جنگ کے کتاب خانے کو دیکھا اور وہاں کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔ واپسی پر وہاں کے کتابخانے کی ایک روداد سپرد قلم کی، جس میں وہاں کے ۲۵ر اہم اور نادر مخطوطات کا تفصیلی تعارف کرایا۔ یہ روداد ۱۹۳۹ء میں احمد یہ پریس، حیدرآباد سے ''مخطوطات تاریخی: مخزونہ کتاب خانہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن شروانی'' کے عنوان سے ۲۳ر صفحات پر شائع ہوئی۔ اس کتاب کے اگلے ایڈیشن میں (میرے پیش نظر پاکستانی ایڈیشن ہے جو واحد بک ڈپو، کراچی سے جون ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا) جس کا عنوان صرف ''مخطوطات تاریخی'' رکھا گیا، حبیب گنج کے علاوہ لٹن لائبریری (موجودہ یونیورسٹی کلکشن) کے مخطوطات اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (موجودہ آفتاب کلکشن) کے مزید بارہ مخطوطات کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔ علی گڑھ کے کتابخانوں کے حوالے سے کل ۳۷ر نادر مخطوطات کا تفصیلی تعارف اس کتابچہ میں ہے۔

(۴) ۱۹۵۲ء میں، مختار الدین احمد [آرزو] نے، جب وہ لٹن لائبریری کے شعبۂ مخطوطات کے ناظم تھے، سلطان جہاں منزل میں مخطوطات و نوادر کی ایک علمی نمائش کا اہتمام کیا تھا، جس کا افتتاح برطانوی مؤرخ برنارڈ لوئیس نے کیا تھا۔ اُس وقت اہم مخطوطات کی ایک فہرست سائیکلو اسٹائل کرادی گئی تھی۔ یہ فہرست علی گڑھ میگزین کے اُس شمارے (۵۲-۱۹۵۱ء) میں بطور ضمیمہ چھپی جسے خلیل الرحمٰن اعظمی اور آفتاب زبیری نے مرتب کیا تھا۔ سید بشیر الدین صاحب (یونیورسٹی لائبریرین) نے ۱۹۵۳ء میں اس فہرست کو مع تصاویر نوادرات، کتابچہ کی صورت میں ۳۲ر صفحات پر مشتمل بعنوان ''فہرست نمائش گاہ مخطوطات و نوادر کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ'' شائع کردیا۔ یہ فہرست

پروفیسر محمد شفیع کی ادارت میں لاہور سے شائع ہونے والے ''اورینٹل کالج میگزین'' کے ۱۹۵۴ء کے ضمیمہ میں بھی شائع ہوئی۔

(۵) پروفیسر مختارالدین احمد [آرزو] نے احسن مارہروی کلکشن میں موجود ۳۲۲/اہم مخطوطات (۲۶/عربی، ۱۷۶/فارسی اور ۱۲۰/اردو) کی ایک وضاحتی فہرست تیار کی تھی جو اورینٹل کالج میگزین (لاہور) کے نومبر ۱۹۵۵ء کے شمارے (جلد ۲۳، عدد ۱، عدد مسلسل ۱۲۳) میں شائع ہوئی۔

(۶) اٹاوہ (یوپی) کے اسلامیہ کالج میں قائم شدہ کتاب خانہ جسے ۱۹۵۵ء میں جواہر لعل نہرو کے نام سے منسوب کر ''جواہر میوزیم'' نام رکھا گیا، اس میں ۱۸۰۰/ سے زائد عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات تھے۔ اس ذخیرے سے ۱۸۲/اہم مخطوطات منتخب کر ایک وضاحتی فہرست اس کتاب خانے کے ناظم محمد ابرار حسین فاروقی نے تیار کی جو ۱۹۵۹ء میں ''تذکرہ جواہر زواہر'' کے عنوان سے اٹاوہ سے شائع ہوئی۔ جواہر میوزیم کا یہ مکمل ذخیرہ، جو ۱۸۲۶/مخطوطات (۵۷۴/عربی، ۱۰۹۹/فارسی اور ۱۵۳/اردو) پر مشتمل ہے، ۱۹۶۱ء میں مولانا آزاد لائبریری منتقل ہو گیا اور آج یہ ''جواہر کلکشن'' کے نام سے موسوم ہے۔

(۷) غازیپور کے رئیس شاہ منیر عالم کا ذخیرۂ کتب مولانا آزاد لائبریری میں گرچہ ۱۹۶۱ء میں آیا لیکن شاہ منیر عالم صاحب نے بذات خود اپنے ذخیرے کی ایک یک سطری فہرست غالباً ۱۹۲۹ء-۱۹۳۰ء میں تیار کی تھی، جس میں اپنے ذخیرے کے ۱۳۷/اہم مخطوطات کا ذکر کیا تھا۔ یہ فہرست ''فہرست کتب قلمی نادرہ وچیدہ من مملوکات جناب شاہ منیر عالم صاحب'' کے عنوان سے ۱۶/صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ فہرست غالباً ذخیرے کے فروخت کے لیے تیار کی گئی تھی جیسا کہ اس کے انگریزی سرورق کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے A Rare Collection of Old MSS. Persian & Arabic Books,For Sale,Address:- S.M.Alam, Ghazipur, U.P, یہ ذخیرہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی قسمت میں تھا لہٰذا ۱۹۶۱ء میں یہ مولانا آزاد لائبریری میں آ گیا۔ اس ذخیرے میں ۱۸۹/مخطوطات (۲۳/عربی، ۱۵۸/فارسی اور ۸/اردو) ہیں۔

(۸) مشہور مؤرخ ڈاکٹر اطہر عباس رضوی نے فارسی مخطوطات کا ایک وضاحتی کیٹلاگ انگریزی زبان میں تیار کیا جو ڈاکٹر مختارالدین احمد [آرزو] کی نظر ثانی کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۶۹ء میں بعنوان Catalogue of the Persian Manuscripts in the Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University, Aligarh شائع ہوا۔ عنوان کے ذیل میں جلد اول لکھا ہے، ممکن ہے کہ جلد دوم بھی تیار کرنے کا ارادہ ہو لیکن وہ دوسری جلد منظر عام پر نہ آسکی۔ پہلی جلد میں تاریخ، خودنوشت، جغرافیہ، علم ہیئت وسفرناموں جیسے موضوعات پر مشتمل ۴۰۳/فارسی مخطوطات کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

(۹) مخطوطات جو خریدے جاتے تھے یا تحفتہً وصول کیے جاتے تھے وہ ''یونیورسٹی کلکشن'' کے تحت رکھے جاتے تھے اور اُن کی ایک مخصوص مدت پر فہرست شائع کی جاتی تھی۔ ایسی ہی ایک فہرست ۱۹۷۳ء میں شائع کی گئی تھی جس میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء کے دوران آنے والے مخطوطات کی فہرست شامل ہے۔ اس کے مرتبین ایم ایچ رضوی (محمد حسین رضوی) اور ایس اے کے غوری (شمشاد احمد خاں غوری) ہیں اور اس کا عنوان Catalogue of Manuscripts added to the Maulana

Azad Library, 1970-1972 ہے۔ یہ فہرست محدود ایڈیشن کے تحت شائع کی گئی تھی۔

(۱۰) محولہ بالا فہرست کی طرز پر ایک دوسری فہرست، جو ۱۹۷۰ء-۱۹۷۷ء کے وقفے پر محیط ہے، ۱۹۸۰ء میں شائع کی گئی۔ اس کا عنوان Catalogue of Manuscripts added to the Maulana Azad Library, 1970-1977 ہے۔ اس میں ان آٹھ برسوں میں خریداری کے ذریعہ یا تحفۃً حاصل ہونے والے ۲۸۴/ فارسی مخطوطات کی تفصیل درج ہے۔ اس فہرست کے مرتبین ایم ایچ رضوی (محمد حُسین رضوی، یونیورسٹی لائبریرین) اور سید محمود حسن قیصر امروہوی ہیں۔

(۱۱) نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا کتاب خانہ آپ کے صاحبزادے عبید الرحمٰن خاں شروانی نے ۱۹۶۰ء میں مولانا آزاد لائبریری کو ہبہ کردیا۔ انگریزی میں اس کی ایک وضاحتی فہرست دو جلدوں میں (سہ حصص در دو جلد) شائع ہوئی۔ پہلی جلد کا پہلا حصہ جو ۴۰۵/ فارسی کلیات و دواوین و منظوم تصانیف پر مشتمل ہے Catalogue of Manuscripts in the Maulana Azad Library, Aligarh Muslim University, Vol I, Habib Ganj Collection (Persian), Part I: Poetry کے عنوان سے ۱۹۸۱ء میں مولانا آزاد لائبریری سے شائع ہوا۔ اس کے مرتبین ایم ایچ رضوی (محمد حُسین رضوی) اور ایم ایچ قیصر (محمود حسن قیصر) ہیں۔ پہلی جلد کا دوسرا حصہ مولانا آزاد لائبریری سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا جو ۴۴۷/ فارسی نثری مخطوطات کا کیٹلاگ ہے۔

(۱۲) ۱۹۸۲ء میں ''فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ: ذخیرۂ شیفتہ'' کے عنوان سے ۲۲۴/ عربی، فارسی و اردو مخطوطات کی ایک موضوعاتی و وضاحتی فہرست مولانا آزاد لائبریری کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس فہرست کو سید محمود حسن قیصر امروہوی نے سید محمد حسین رضوی (یونیورسٹی لائبریرین) کی زیرنگرانی تیار کیا۔ یہ فہرست ۱۹۳۲ء میں شائع شدہ ابوبکر محمد شیث جونپوری کی تیار کردہ فہرست کا اضافہ شدہ ایڈیشن ہے۔

(۱۳) ۱۹۸۳ء میں ''فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ: ذخیرۂ احسن مارہروی'' کے عنوان سے ۴۴۷/ عربی، فارسی وار دو مخطوطات کی ایک موضوعاتی و وضاحتی فہرست مولانا آزاد لائبریری کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس فہرست کو سید محمود حسن قیصر امروہوی نے سید محمد حسین رضوی (یونیورسٹی لائبریرین) کی زیرنگرانی تیار کیا۔ احسن مارہروی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک تھے۔ ۱۹۴۰ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے وارثین نے ۱۹۴۱ء میں آپ کا ذخیرۂ کتب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ہبہ کردیا۔

(۱۴) ۱۹۸۵ء کے ماہ فروری میں خدا بخش لائبریری، پٹنہ کی طرف سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ''جنوب ایشیائی علاقائی تصوف سمینار'' کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس موقع پر مولانا آزاد لائبریری میں موجود تصوف پر مبنی ۵۶۵/ فارسی اور ۱۲۳/ عربی مخطوطات کی ۱۵۲/ صفحات پر مشتمل ایک یک سطری فہرست (Hand list) ''مرآۃ التصوف'' کے عنوان سے سید محمود حسن قیصر نے تیار کی تھی، جو مولانا آزاد لائبریری کی طرف سے شائع اور تقسیم ہوئی۔

(۱۵)۱۹۸۶ء میں ''فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ : ذخیرۂ آفتاب'' کے عنوان سے ۱۳۱/مخطوطات (۶۶/عربی،۶۲/ فارسی و۳/ اردو مخطوطات) کی بزبان اردوایک موضوعاتی و وضاحتی فہرست مولانا آزادلائبریری کی طرف سے شائع ہوئی۔اس فہرست کے مرتبین میں سیدمحمد حُسین رضوی (یونیورسٹی لائبریرین)اورسیدمحمود حسن قیصر امروہوی کے نام درج ہیں۔یہ ذخیرہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نسبت سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا عطیہ ہے۔

(۱۶) ایک جرمن مستشرق Dr. Hans Daibar نے ہندوستان کے اپنے ایک علمی سفر (۲۰/دسمبر۱۹۸۴ء تا ۳۰/جنوری ۱۹۸۵ء) کے دوران یہاں کی مختلف مشرقی لائبریریز کے اہم مخطوطات کا انتخاب کیااور ان کا تفصیلی تعارف اپنے ایک انگریزی مقالے New Manuscripts Finding from Indian Libraries میں کیا۔ یہ مقالہ جرمنی سے شائع ہونے والے انگریزی مجلّے Manuscripts of the Middle East کے شمارہ نمبرایک(۱۹۸۶ء) میں شائع ہوا۔اس مقالے میں مولانا آزادلائبریری کے یونیورسٹی کلکشن کے ۹ عربی مخطوطات، جواسلامی فلسفہ سے متعلق ہیں، کاتفصیلی تعارف کرایا ہے۔

(۱۷) خدابخش لائبریری، پٹنہ کی طرف سے ۱۹۹۳ء میں ''ہنداز بکستان تعلقات'' پرایک سمینار دہلی میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس موقع پر مولانا آزاد لائبریری میں موجود ترکی مخطوطات پر مشتمل ایک وضاحتی کیٹلاگ ڈاکٹر عطاخورشید نے بزبان انگریزی تیار کیا جوخدابخش لائبریری کی طرف سے شائع ہوااور اس سمینار کے موقع پر تقسیم کیا گیا تھا۔اس کیٹلاگ میں ۲۳/ترکی مخطوطات کے تفصیلی کوائف دیے گئے ہیں۔

(۱۸) حبیب گنج کلکشن کے عربی مخطوطات کی وضاحتی فہرست Descriptive Catalogue of Arabic Manuscripts of Habib Ganj Collection, Maulana Azad Library کے عنوان سے۱۹۹۳ء میں مولانا آزاد لائبریری سے شائع ہوئی۔اس کے مرتب ایم ایچ قیصر (محمودحسن قیصر) ہیں۔اس جلد میں ۸۱۳/عربی مخطوطات کے تفصیلی کوائف درج کیے گئے ہیں۔

(۱۹) ڈاکٹر نذیر احمد (سابق صدر شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے مولانا آزادلائبریری کے کچھ اہم مخطوطات پر ایک تفصیلی مقالہ قلمبند کیا جو''مولانا آزادلائبریری کے ذخائر مخطوطات پر ایک نظر'' کے عنوان سے جام شورو (سندھ، پاکستان) کے مجلّہ ''تحقیق'' کے شمارہ ۷ (۱۹۹۳ء) میں شائع ہوا۔اس مقالے میں فارسی کے ۶۰/اہم مخطوطات کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔

(۲۰) خدابخش لائبریری، پٹنہ کی طرف سے ''ہندی الاصل مذاہب'' پر منعقدہ سمینار (۱۹۹۴ء) کے موقع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے صدر ڈاکٹر جعفر رضا شیلیش زیدی نے مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہندومت سے متعلق فارسی مخطوطات کا ایک وضاحتی کیٹلاگ بزبان انگریزی تیار کیا۔اس میں ۶۵/ فارسی مخطوطات کے وضاحتی و تفصیلی کوائف درج کیے گئے ہیں۔اس کتابچہ کا عنوان، جو ۸۶ صفحات پر مشتمل ہے:

Hinduism in Aligarh Manuscripts
Descriptive Catalogue of Persian MSS. of Maulana Azad Library, A.M.U., Aligarh on Hindu Legends, Philosophy & Faith.

ہے۔یہ کیٹلاگ خدابخش لائبریری، پٹنہ سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔

(۲۱) ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر عطا خورشید کی تیار کردہ مولانا آزاد لائبریری میں موجود تقریباً ۱۲۰۰؍اردو مخطوطات کی ایک وضاحتی فہرست ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے اردو مخطوطات'' کے عنوان سے خدا بخش لائبریری، پٹنہ کی طرف سے شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔

(۲۲) ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی سے منسلک ادارہ ''نور مائیکروفلم'' نے، جس کے ناظم ڈاکٹر خواجہ پیری ہیں، ۱۹۹۶-۱۹۹۷ء میں مولانا آزاد لائبریری کے عربی و فارسی مخطوطات کی مائیکروفلم تیار کی تھی۔ انہیں مائیکروفلم کی مدد سے فارسی زبان میں دو جلدوں میں ان کی ایک وضاحتی فہرست بعنوان ''فہرست میکروفیلم نسخہ ہای خطی فارسی و عربی کتابخانہ مولانا آزاد، دانشگاہ اسلامی، علیگر، ھند'' تیار کی، جس کی پہلی جلد ۲۰۰۰ء میں مرکز میکروفیلم نور، دہلی سے شائع ہوئی۔ اس پہلی جلد میں ۲۰۳۵؍فارسی و عربی مخطوطات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

(۲۳) ''فهرست میکروفیلم نسخه های خطی فارسی و عربی کتابخانه مولانا آزاد، دانشگاه اسلامی، علیگر، هند'' کی دوسری جلد ۲۰۰۲ء میں مرکز میکروفیلم نور، دہلی سے شائع ہوئی۔ اس فہرست میں ۶۹۲؍عربی و فارسی مخطوطات کے کوائف درج کیے گئے ہیں جن میں ۳۰۰ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری کے ہیں اور بقیہ ۳۹۲ مخطوطات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

(۲۴) لندن کے اسلامی ثقافتی ادارہ Al-Furqan Islamic Heritage Foundation کی طرف سے دنیا کے مختلف کتاب خانوں کی فہرست سازی کا کام شروع کیا گیا۔ ان کتاب خانوں کے ذیل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری بھی تھی، جس کے مخطوطات کی فہرست سازی کی ذمہ داری پروفیسر یسین مظہر صدیقی (سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز) کے سپرد ہوئی۔ کام مکمل ہونے کے بعد اس فہرست کی پہلی جلد لندن کے موسسۃ الفرقان للتراث الاسلامی سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی جس میں ۵۰۰؍عربی مخطوطات کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔

(۲۵) ۲۰۰۵ء میں مولانا آزاد لائبریری کے کیٹلاگر سید محمود حسن قیصر کی ایک تصنیف بعنوان ''مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نادر مخطوطات'' انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں مولانا آزاد لائبریری کے ۲۳۹؍عربی و فارسی کے نادر مخطوطات کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔

(۲۶) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اجمل خاں طبیہ کالج کی لائبریری کے مخطوطات، حفاظت اور استفادے کے مدنظر ۲۰۰۷ء میں مولانا آزاد لائبریری منتقل کر دیے گئے۔ اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ڈاکٹر عطا خورشید نے ''فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری: طبیہ کالج کلکشن'' کے عنوان سے ان مخطوطات کی ایک موضوعاتی و وضاحتی فہرست تیار کی جو ۲۰۱۰ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ اس فہرست میں ۲۷۰؍فارسی، ۱۱۲؍عربی اور ۱۵؍اردو مخطوطات کی تفصیلات دی گئی ہیں۔

(۲۷) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ''ادارۂ تحقیقات فارسی'' کی طرف سے ایک پروجکٹ کے تحت انگریزی زبان میں مولانا آزاد لائبریری کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست سازی کا کام شروع کیا گیا جس کے ذیل میں Catalogue: Persian Manuscripts of Subhanallah Collection in

Maulana Azad Library کے عنوان سے سرفراز احمد خاں نے پہلی جلد تیار کی جو اسی ادارے سے ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی۔ اس وضاحتی فہرست میں سبحان اللہ کلکشن میں موجود ۸۳ر فارسی کلیات ودواوین کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔

(۲۸) ''مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں ابن سینا کے مخطوطات'' کے عنوان سے ڈاکٹر عطا خورشید کا ایک مقالہ سہ ماہی ''دبیر''، لکھنو کے اکتوبر ۲۰۱۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں مولانا آزاد لائبریری میں موجود ابن سینا کے تقریباً ڈیڑھ سو مخطوطات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

(۲۹) ''مولانا آزاد لائبریری میں عہد قطب شاہی کے مخطوطات'' کے عنوان سے ڈاکٹر عطا خورشید کا ایک مقالہ ششماہی ''تحصیل''، کراچی کے شمارۂ اول (۲۰۱۷ء) میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں دکن کے قطب شاہی کتب خانوں میں موجود ان ۹ مخطوطات کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے جو اَب مولانا آزاد لائبریری کی زینت ہیں۔

محولہ بالا سبھی فہرستیں ذخیرے یعنی کلکشن کے اعتبار سے، زبان کے اعتبار سے یا موضوع کے اعتبار سے تیار کی گئیں اور شائع کی گئیں۔ انہیں تیار کرنے والے اہل علم اور ماہرین مخطوطات میں سے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مولانا آزاد لائبریری کے تمام مخطوطات کی ایک کلی اور جامع فہرست (Union Catalogue) تیار کی جائے تاکہ بیک نظر یہاں کے مخطوطات سے استفادہ کیا جاسکے۔ یہ جان کر ہمیں خوشی ہوئی کہ مولانا آزاد لائبریری کی ایک جامع فہرست ''فہرست مخطوطاتِ مولانا آزاد لائبریری'' کے عنوان سے دو جلدوں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اشاعتی ادارے یعنی ''پبلیکیشنز ڈویژن'' کی طرف سے شائع ہوئی۔ پہلی جلد عنوان کے اعتبار سے اور دوسری جلد مصنف کے اعتبار سے چھاپی گئی ہے۔ مرتب کی حیثیت سے ڈاکٹر امجد علی کا نام ہے۔ اس فہرست کو دیکھ کر فارسی کا مصرع ''ای بسا آرزو کہ خاک شدہ'' یاد آ گیا۔ فی الوقت جلد اول پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

۶۴۸ صفحات پر مشتمل اس فہرست کی پہلی جلد میں ۱۴۸۷۷ مخطوطات کا اندراج ہے۔ اندراجات میں تکرار بہت ہے لہٰذا مذکورہ بالا تعداد کو حتمی تعداد نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ تکرار کے علاوہ مخطوطات کی ایک اچھی خاصی تعداد مندرج ہونے سے رہ گئی ہے۔ مثلاً سبحان اللہ کلکشن کے مطبوعہ قدیم کیٹلاگ میں کچھ مخطوطات درج ہونے سے رہ گئے تھے جنھیں دوسری جلد میں شائع کرنا تھا، جو جلد بوجوہ شائع نہ ہوسکی۔ انہیں 'ضمیمہ' کا عنوان دے کر اسی کلکشن میں محفوظ رکھا گیا ہے اور ان کا اندراج ایک رجسٹر میں کردیا گیا ہے جن کی تعداد ۳۸۷ ہے۔ یہ ۳۸۷ مخطوطات پیش نظر کیٹلاگ میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ اسی طرح سیکڑوں کی تعداد میں ایسے مخطوطات ہیں جن کا اندراج اس نئے کیٹلاگ میں نہیں کیا گیا ہے مشتے نمونہ از خروارے اس فہرست کے ابتدائی ۱۰ صفحات پر ایک نظر ڈالتے ہیں کہ کتنے مخطوطات اس میں شمولیت سے رہ گئے ہیں جو ان ۱۰ صفحات میں جگہ پاسکتے تھے:

۱۔ آتشکدۂ آذر/ لطف علی بیگ آذر اصفہانی/ فارسی/ یونیورسٹی اخبار ۹۴

۲۔ آخرت نامہ/ محمد رمضان شاہ/ اردو/ سلیمان ۶/ ۹۴

۳۔ آداب الحرمین/ مجہول المؤلف/ اردو/ جواہر ۹۴

۴۔ آداب ذکر/ فضل اللہ اصفہانی/ فارسی/ منیر عالم ۱۱/ ۵

۵۔ آداب الرسول/ شمس الدین محمد بن محمد بن الجزرلی الشافعی/

عربی/ سبحان اللہ ۲/۲۲، ۲۹۷
۶۔ آداب العرب والفرس/ احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ/ عربی/ حبیب گنج ۱۵/ ۳۰ اور ۱۸/ ۳۰ (دو نسخے)
۷۔ آداب الکتاب/ ابن قتیبہ الدینوری/ عربی/ حبیب گنج ۱۷/ ۲۶
۸۔ آداب المطالعہ/ عضدالدین عبدالرحمٰن/ عربی/ سلیمان ۱۵/۱۰۶ اور سبحان اللہ ۱۸/ ۲۷،۸۹۲
۹۔ آداب نماز/ سید علی بن سید محمد بخاری/ فارسی/ سبحان اللہ ۱/ ۷/ ۳،۲۹۷
۱۰۔ آرا اھل المدینۃ الفاضلۃ/ الفارابی/ عربی/ سبحان اللہ ۴۲/ ۱۱۰
۱۱۔ آرائش محفل/ میر شیر علی افسوس/ اردو/ جواہر ۶۰
۱۲۔ آہ نیم شبی/ قاضی میر خادم حسن فضلی/ اردو/ حبیب گنج ۱۶۴/ ۵۴
۱۳۔ ابراہیمیہ/ محمد وارث بن نور محمد/ فارسی/ سبحان اللہ/ ۵۹/ ۷،۲۹۷
۱۴۔ ابطال الباطل/ روزبھان البقلی/ عربی/ یونیورسٹی مذہب (۳) ۷۶
۱۵۔ ابواب علاج/ محمد روشن ضمیر/ فارسی/ ضمیمہ سبحان اللہ ۳۸/ ۶۱۶
۱۶۔ ابھۃ الطرحۃ فی القضا بالموجب والفرق....../ محمد بن طولون الصالحی الدمشقی/ عربی/ یونیورسٹی مذہب ۲۴/ ۵۰
۱۷۔ الاتمام الدرایۃ لقرآۃ النقایۃ/ جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی/ عربی/ شیفتہ ۶۹/ ۶۲
۱۸۔ اثبات الدوام/ صدرالدین شیرازی/ عربی/ عبدالسلام ۷۷/ ۷۵۳
۱۹۔ اثبات المفارقات/ الفارابی/ عربی/ سبحان اللہ ۴۴/ ۱۱۰
۲۰۔ اثنا عشریات فی الطہارۃ والزکوۃ والخمس والحج والصوم/ بہاء الدین محمد العاملی/ عربی/ سبحان اللہ ۲/ ۳،۲۹۷
۲۱۔ اجادۃ النجدۃ/ تاج الدین بن احمد/ عربی/ جواہر ۱۸۹
۲۲۔ الاجازات/ نعمان خیر الدین آلوسی زادہ/ عربی/ جواہر ۱۸۹
۲۳۔ اجمع/ سید نوازش علی بن سید ناصر علی نگینوی/ فارسی/ حبیب گنج ۲۳/ ۱۷
۲۴۔ الاحادیث المتواترہ مختصر من رسالۃ السیوطی/ شیخ علی بن حسام الدین علی المتقی الھندی/ عربی/ سلیمان ۱۷/ ۲۸
۲۵۔ الاحادیث مدار الاسلام/ ابن الصلاح/ عربی/ آفتاب/ ۹/ ۲۲
۲۶۔ احادیث المرویۃ فی ظہور دولۃ الصفویۃ/ محمد باقر مجلسی/ فارسی/ سبحان اللہ ۳/ ۲،۲۹۷
۲۷۔ احصاء الابواب التی فی مختصر کتاب المدنی/ الفارابی/ عربی/ آفتاب ۹/ ۲۲
۲۸۔ احوال حضرت نظام الدین اولیا/ مجہول المؤلف/ اردو/ حبیب گنج ۶/ ۲۲
۲۹۔ احوال سیارات بموجب علم جدید فرنگ/ مجہول المؤلف/ فارسی/ یونیورسٹی علوم ۳/ ۱۸
۳۰۔ احوال شیخ کلیم اللہ جہان آبادی/ مجہول المؤلف/ فارسی سلمان ۱۵/ ۱۱۵
۳۱۔ احوال ظہور سری گپت و بیان رسمیات پوجا خاندان/ لالہ تلسی داس کایستھ/ فارسی/ سبحان اللہ ۶/ ۲۰۰
۳۲۔ احوال نانک شاہ درویش/ بدھ سنگھ لاہوری/ فارسی/ عبدالسلام ۲۲/ ۱۵۶
۳۳۔ احیاء المیت بفضائل اھل البیت/ جلال الدین السیوطی/

عربی/ سبحان اللہ ۳۱/۲/ ۲۹۷ء

۳۴۔ اخبار الکرام باخبار مسجد الحرام/ احمد بن محمد الاسدی الشافعی/ عربی/ حبیب گنج ۱۰۰/ ۳۳

۳۵۔ اختراع تازہ/ میر حسن تنہا/ فارسی/ حبیب گنج ۱۱۴/ ۵۰

۳۶۔ اختلال ادوار/ مرزا نصیر الدین محمد المتخلص بہ علیل/ اردو/ یونیورسٹی ضمیمہ تاریخ نمبر ا

۳۷۔ اختیار/ سلامت علی خاں/ فارسی/ حبیب گنج ۳۴/ ۱۷

۳۸۔ ادات الفضلا/ قاضی خان بدر محمد دہلوی/ فارسی/ یونیورسٹی لغات ۵

۳۹۔ ادب الکاتب/ ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ الدینوری/ عربی/ حبیب گنج ۱۷/ ۲۶

۴۰۔ الادب المفرد/ محمد بن اسمعیل البخاری/ عربی/ عبدالحیی ۱۵۲/۱۱

۴۱۔ ادب النفس/ محمد بن حسن بن قاسم الحسینی العاملی/ عربی/ سبحان اللہ/ ۶/ ۲۹۷ء

۴۲۔ الادب الولوی فی شرف النسب النبوی/ جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی/ عربی/ حبیب گنج ۴۰/ ۹

۴۳۔ ادعیہ اثناء عشرہ/ قاضی نوراللہ شوشتری/ عربی/ سبحان اللہ ۳/۲/ ۲۹۷ء

۴۴۔ ادیبا لآداب درویش/ دین محمد/ فارسی/ سلیمان ۳۱/ ۱۳۱

۴۵۔ اذکار ماہ رمضان/ لامعلوم الاسم/ فارسی/ حبیب گنج ۸/ ۲

۴۶۔ اذکار محمدی/ محمد ولی حیدر حسینی ترمذی فرخ آبادی/ اردو/ حبیب گنج ۶/ ۹

۴۷۔ ارتشاف الضرب من لسان العرب/ ابو حیان الاندلسی/ عربی/ حبیب گنج ۱۰/ ۳۷

۴۸۔ الارجوزۃ العروضیۃ/ ابو محمد القاسم محمد بن علی الحریری/ عربی/ حبیب گنج ۴/۲/ ۵۲

۴۹۔ ارشاد الی الاعتقاد فی اصول الدین/ برہان الدین ابوالقاسم بن مطیر الیمنی الشافعی/ عربی/ ضمیمہ سبحان اللہ ۸۳/۳/ ۲۹۷ء

۵۰۔ ارشاد الحیاری فی حل ذبیحۃ الیہود والنصاری/ محمد بن طولون الصالحی الدمشقی/ عربی/ یونیورسٹی مذہب (۳)/۲/ ۵۰

۵۱۔ الارشاد لمصالح الانفس والاجساد/ اسمعیل بن ھبۃ اللہ/ عربی/ یونیورسٹی ضمیمہ ۴-۷

۵۲۔ ارشاد المریدین/ شیخ حسین خوارزمی/ فارسی/ سبحان اللہ ۱/ ۱۷/ ۲۹۷ء

۵۳۔ ارشاد المریدین و تذکرۃ الذاکرین/ شاہ عبدالرزاق قادری/ فارسی/ سبحان اللہ ۶۰/ ۷/ ۲۵۷ء

۵۴۔ ارکان ثلثۃ فی مناسک الحج/ جمال الدین بن محمد اثیم/ عربی/ ضمیمہ سبحان اللہ ۸۲/۳/ ۲۹۷ء

۵۵۔ اساس الاقتباس/ اختیار بن غیاث الدین حسینی/ عربی/ حبیب گنج ۶۳/ ۲۸

۵۶۔ اساس البلاغہ/ جاراللہ الزمخشری/ عربی/ ضمیمہ سبحان اللہ ۱۶/ ۲۹/ ۸۹۲ء

۵۷۔ اسانید الاساتیذ/ محمد بن محمد الامیر/ عربی/ حبیب گنج ۶۰/ ۱۳

۵۸۔ اسباب سرکشی ہندوستان/ سید احمد خان/ اردو/ یونیورسٹی ۹

۵۹۔ استفسار فی رد نصاری/ مولوی آل حسن/ اردو/ جواہر ۷

۶۰۔ استیعاب فی معرفۃ الاصحاب/ ابو عمر یوسف بن عبداللہ القرطبی/ عربی/ ضمیمہ سبحان اللہ ۲۱۲/۷/ ۲۹۷ء

۶۱۔ اسرار الحسنیہ/ سید حسن علی عرف علی حسن/ اردو/ سبحان اللہ/ ۵۲۰

۶۲۔ اسرار الحق/ برہان الدین بن میران جی/ فارسی/ حبیب گنج ۲/۲۲۲/۲۱

۶۳۔ اسرار الصلوۃ/ خواجہ محمد میر بن میر ناصر عندلیب/ فارسی/ حبیب گنج ۲/۱۴۶/۲۱

۶۴۔ اسراریہ فی علم الحروف/ شاہ نوراللہ/ عربی/ سبحان اللہ/۱/۴۰۰

۶۵۔ الاسفار الاربعہ/ ملا صدرا شیرازی/ عربی/ حبیب گنج ۱۹-۱۶/۳۹

۶۶۔ اسماء الصحابۃ البدریین/ جعفر بن حسن بن عبدالکریم البرزنجی/ ضمیمہ سبحان اللہ/ ۷/۹۲۰

محولہ بالا تعداد کی روشنی میں شامل نہ کیے جانے والے مخطوطات کا اگر تناسب نکالا جائے تو تقریباً ڈھائی ہزار مخطوطات شامل ہونے سے رہ گئے جو اس کیٹلاگ کی جامعیت اور کاملیت پر سوال اُٹھاتے ہیں۔

فہرست کے آغاز میں شیخ الجامعہ پروفیسر طارق منصور صاحب کا انگریزی زبان میں Blessing کے عنوان سے ایک پیغام ہے جس میں انھوں نے مرتب فہرست ڈاکٹر امجد علی صاحب کو اس کیٹلاگ کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے اسے ملک اور بیرون ملک کے مشرقی علمی اداروں کے لیے نہایت ہی مفید بتایا ہے۔ اگلے صفحے پر پروفیسر عزیز الدین صاحب (سابق صدر شعبۂ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ و سابق ڈائریکٹر رضا لائبریری، رامپور) کی ایک انگریزی رپورٹ شامل ہے۔ اس سے اگلے دو صفحات پر پروفیسر اصغر عباس صاحب (سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا حرفے چند (حرف چند؟) شامل اشاعت ہے۔ اس سے آگے تین صفحات پر ڈاکٹر امجد علی صاحب (مرتب کیٹلاگ) کا 'مقدمہ' اور اس کے بعد اگلے گیارہ صفحات پر 'تعارف' کے عنوان سے ڈاکٹر امجد علی صاحب کا ہی تفصیلی مضمون شامل ہے۔ اس کے بعد فہرست شروع ہوتی ہے۔

سب سے پہلے سرورق پر نظر ڈالیں۔ لکھا ہے ''ترمیم و ترتیب ڈاکٹر امجد علی''۔ حیرت ہوئی کہ یہاں لفظ ''ترمیم'' کا کیا موقع ہے اور کیٹلاگر نے کیا سمجھ کر اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ فہرست کے آغاز میں کیٹلاگر موصوف کی دو تحریریں ''مقدمہ'' اور ''تعارف'' شامل ہیں۔ ''تعارف'' کے ذیل میں انھوں نے مولانا آزاد لائبریری کے شعبۂ مخطوطات نیز پیش نظر کیٹلاگ کا تعارف لکھا ہے۔ اس کے مطالعہ کے دوران چند باتیں نظر آئیں جو محل نظر ہیں۔ مثلاً یہ تعارفی تحریر گیارہ صفحات پر مشتمل ہے لیکن ان پر صفحہ نمبر نہیں ڈالا گیا ہے (غالباً قدیم مخطوطات کی پیروی کی گئی ہے جب صفحہ یا ورق نمبر نہیں ڈالے جاتے تھے۔ لیکن ورق شماری کے لیے 'ترک' یا 'رکاب' کا استعمال کیا جاتا تھا، اسی طرز قدیم کی پیروی کر لیتے۔)۔ بہر حال میں نے اپنی سہولت کی خاطر اس پر صفحہ نمبر ثبت کر دیا ہے۔

فہرست میں ترتیب مخطوطہ کے عنوان کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ اپنے تعارف میں کیٹلاگر موصوف نے 'فن' کے لیے ایک خانہ مختص کرنے کی بات کی ہے، لیکن اس کیٹلاگ میں ایسا کوئی کالم نہیں ہے جس میں مخطوطے کے فن کا ذکر ہو۔ مرتب موصوف نے مصنف کے نام کے ساتھ کاتب کا نام لکھنے کا ذکر کیا ہے لیکن کسی مخطوطے کے اندراج میں کاتب کا نام مذکور نہیں ہے۔ ایک خانے میں مخطوطے کی زبان کا ذکر ہے لیکن اس میں بھی یکسانیت نہیں ہے مثلاً کہیں 'فارسی' تو کہیں 'فارسیہ'، کہیں 'عربی' تو کہیں 'عربیہ'۔

تمام فہرستیں جو الفبائی ترتیب سے مرتب ہوتی ہیں، حرف

الف سے ان کا آغاز ہوتا ہے لیکن یہ واحد فہرست ہے جس کا آغاز حرف 'ت' سے ہوتا ہے یعنی پہلا اندراج ''تحفۃ الاحرار'' کا ہے۔ نمبرا سے نمبر۱۹۲ تک یہی الفبائی ترتیب ہے۔ نمبر۱۹۳ سے پھر ایک نئی الفبائی ترتیب یعنی الف ممدودہ سے آغاز ہوتا ہے جو آخری اندراج یعنی ۱۴۸۷ پر ختم ہوتا ہے۔ ترتیب میں 'ال' کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ عربی زبان کا ایک مبتدی طالبعلم بھی اس بات سے واقف ہے کہ فہرست کی ترتیب میں 'ال' کو حذف کر دیا جاتا ہے، لیکن اس فہرست میں اسے بحال رکھا گیا ہے۔ چنانچہ نمبر۲۷۴ سے نمبر۱۶۸۲ تک کے اندراجات 'ال' کے ساتھ ہیں۔ جس عنوان کے ساتھ 'ال' نہ لگا ہے وہ اپنی صحیح حالت میں ہے اور اس کا اندراج صحیح جگہ ہے۔ مثلاً ایک اندراج ''الاوراد الفتحیہ'' ال کے ذیل میں (نمبر۸۲۳) تو دوسرا اندراج صرف ''اوراد فتحیہ'' 'او' کے تحت (نمبر۱۹۷۰) کیا گیا ہے۔ ایسے ہی بیشمار اندراجات ہیں کہ ایک ہی مخطوطہ 'ال' کے ساتھ بھی ہے اور 'ال' کے بغیر بھی ہے جس کے سبب اس کا اندراج دو جگہ کر دیا گیا ہے۔

جہاں تک زبان کے اندراج کا تعلق ہے وہاں بھی معاملات بڑے ہی دلچسپ نظر آتے ہیں۔ مثلاً عبدالحیی گلکلشن میں ۱۱۹۴عربی، ۲۳۶ فارسی اور ۸ اردو مخطوطات ہیں۔ معلوم نہیں کیوں سبھی فارسی اور اردو مخطوطات کو فارسی/اردو زبان کے تحت بھی رکھا ہے اور عربی زبان کے ذیل میں بھی۔ اس طرح عبدالحیی گلکلشن کے سبھی فارسی اور اردو مخطوطات کا مکرر اندراج ہوا ہے مثلاً نمبر۲۳۱ اور ۲۳۲؛ ۲۶۰ اور ۲۶۱؛ ۳۳۶ اور ۳۳۷؛ ۳۵۷ اور ۳۵۸؛ ۳۵۹ اور ۳۶۰ قیاس علی ہذا۔ اس طرح تقریباً ڈھائی سو اردو و فارسی مخطوطات کو عربی کے ذیل میں بھی رکھا گیا ہے۔

یہ کیٹلاگ نہایت ہی بددلی سے تیار کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذخیرے کا قدیم قلمی رجسٹر کمپوزر کے حوالے کر دیا گیا اور اس نے جس طرح غلط سلط ٹائپ کر دیا اسے بجنسہ چھاپ دیا گیا۔ نا تو مخطوطے کو براہ راست دیکھنے کی زحمت اُٹھائی گئی اور نا ہی کتب مراجع سے مدد لی گئی۔ مکمل کیٹلاگ کا جائزہ لینا تو اس وقت ممکن نہیں کہ اسی ضخامت کی ایک تبصراتی کتاب تیار ہو جائے گی، لہٰذا مشتے نمونہ از خروارے کے تحت اس فہرست کے ابتدائی ۱۰ صفحات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

- صفحہ ا، نمبرا: جامی کا سال وفات ۸۹۷ نہیں بلکہ ۸۹۸ ہے

- صفحہ ا، نمبر۲: ''سلابان و ابسال'' غلط ''سلامان و ابسال'' درست

- صفحہ ا، نمبر۴ و ۵: مخزن الغرائب، جلد اول و دوم۔ مصنف (احمد علی ہاشمی سندیلوی) نے یہ تذکرہ ایک ہی جلد میں لکھا تھا۔ ضخامت کے سبب اہل کتابخانہ نے اس کی تین حصوں میں جلد بندی کرا دی جسے کیٹلاگر نے جلد یعنی Volume لکھ دیا ہے اسے Part لکھنا چاہیے تھا۔ کیٹلاگر نے صرف دو حصوں کا ذکر کیا ہے جبکہ اس کا تیسرا حصہ بھی اسی ذخیرے (حبیب گنج) میں محفوظ ہے۔ پہلے حصے میں مصنف کا پورا نام مع ولدیت (احمد علی ہاشمی سندیلوی ولد شیخ غلام محمد بن مولوی محمد حاجی) لکھا ہے جبکہ دوسرے حصے کو کیٹلاگر نے مصنف کے دادا (مولوی محمد حاجی) سے منسوب کر دیا ہے۔

- صفحہ ا، نمبر۶۔ ''بحرالجواہر'' کے دو مزید نسخے نمبر ۲۰۷۶ اور ۲۰۷۷ (صفحہ ۹۶) پر بھی مندرج ہیں۔ اس کتاب کا مکمل عنوان لکھنا چاہیے ''بحرالجواہر فی تحقیق المصطلحات الطبیۃ من العربیۃ واللاطینیۃ والیونانیۃ''۔

- صفحہ ا، نمبر ۷: ''تذکرہ اولی الالباب والجامع للعجب العجاب'' اس کے دوسرے نسخے کا اندراج صفحہ ۵ کے نمبر ۹۷ پر ہے۔

- صفحہ ا، نمبر ۹: ''رسالہ فی منازل القمر وغیرہ'' اسی عنوان سے اس کا دوسرا نسخہ صفحہ ۸ کے نمبر ۱۴۴ پر ہے۔ دونوں اندراج میں مصنف کے خانے میں ''مجہول الاسم'' لکھا ہے۔ اس کتاب کا عنوان ''کتاب المیالاطیس الاکبر فی بیان منازل القمر مع طلسمات القمر و متعلقاتہ'' ہے اور یہ ایک یونانی مصنف ''ھرمس'' کی تصنیف ہے۔

- صفحہ ا، نمبر ۱۰: ''رسالہ موجز'' کے مصنف کا نام ''الخرم القرشی'' لکھا ہے جبکہ ''الحزم القرشی'' ہونا چاہیے۔ اس رسالے کے مزید دس نسخے نمبر ۱۴۰۱۲ تا ۱۴۰۲۱ پر ہیں اور سبھی کے مصنف کا نام الحزم کی جگہ الخرم لکھا ہے۔

- صفحہ ا، نمبر ۱۱: ''شرح قرشی......'' کے مصنف بھی وہی ''الحزم القرشی'' ہیں جنھیں ''الخرم القرشی'' لکھا ہے۔

- صفحہ ا، نمبر ۱۴: ''نفائس الفنون فی عرائس العیون (جلد دوم)'' کی جلد اول کا اندراج نمبر ۱۴۳۹۸ پر ہے۔ ایک جلد کا اندراج صفحہ ا پر اور دوسری جلد صفحہ ۶۲۷ پر؟؟؟

- صفحہ ا، نمبر ۱۷: ''پادشاہ نامہ (V.2)'' کی پہلی جلد کا اندراج صفحہ ۱۱۳ کے نمبر ۲۴۴۹ پر کیا گیا ہے۔ ایک جلد صفحہ ا پر اور دوسری جلد صفحہ ۱۱۳ پر؟؟؟

- صفحہ ا، نمبر ۱۸: ''تاریخ عالم آرائے عباسی (V.2)'' کی جلد اول اور جلد سوم کا اندراج صفحہ ۱۲۳ کے نمبر ۲۶۷۴ اور ۲۶۷۵ پر کیا گیا ہے۔

- صفحہ ا، نمبر ۲۰: ''آئین اکبری (شنگرف نامہ)'' آئین اکبری کا نام شنگرف نامہ نہیں ہے۔ شنگرف نامہ ایک علاحدہ کتاب ہے۔ ''آئین اکبری'' کے ایک دوسرے نسخے کا اندراج صفحہ ۱۱ کے نمبر ۲۲۱ پر کیا گیا ہے۔

- صفحہ ۲، نمبر ۲۶: ''اسماء الضعفاء......(ج ا)'' جلد ۲ کا اندراج صفحہ ۲۵ کے نمبر ۵۲۶ پر۔

- صفحہ ۲، نمبر ۲۸: مصنف کا نام ''...... المعروف بشقورۃ'' نہیں بلکہ ''......المعروف بشقروۃ الاصفہانی'' ہے۔

- صفحہ ۲، نمبر ۲۹: کتاب کا صحیح اور مکمل عنوان ہے ''الاکمال فی رفع الارتیاب عن المؤتلف والمختلف من الاسماء والکنی والالقاب''۔ اور اس کے مصنف کا نام ''الجرباذقانی (الجرباذقانی نہیں) مشہور بہ ابن ماکولا'' ہے جس کا سنہ وفات ۴۷۵ھ/۱۰۸۲ء ہے، ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ نہیں جیسا کہ کیٹلاگر موصوف نے لکھا ہے۔ اس کا دوسرا نسخہ صفحہ ۳۹ کے نمبر ۸۰۹ پر مندرج ہے۔ وہاں اس کے مصنف کا نام ''ابن ماکولا'' کی جگہ ''ابن باکولا'' درج ہے جو درست نہیں۔

- صفحہ ۲و۳، نمبر ۳۹و۴۰: ''القانون'' کا اندراج دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس لائبریری میں فقط دو ہی نسخے ہیں جبکہ بگڑی ہوئی ترتیب کے سبب القانون کے مزید ۱۳ نسخے صفحہ نمبر ۶۱ تا ۶۳ پر محیط ہیں۔ القانون کے ذیل میں البیرونی کی ''القانون المسعودی'' کا بھی اندراج کر دیا گیا ہے دیکھیے صفحہ ۶۲۔

- صفحہ ۳ پر قرآن مجید کے صرف چار نسخوں (نمبر ۴۱ تا ۴۴) کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ بقیہ نسخوں کا اندراج، جو سینکڑوں کی تعداد میں ہیں، صفحہ نمبر ۶۳ تا ۶۷ نیز صفحہ ۲۰۱ پر مندرج ہیں؟؟؟

- صفحہ ۳، نمبر ۴۵ تا ۴۷ پر ابن ابی شیبہ کی ''المصنف'' کے تین حصوں (حصہ ۱، ۲، اور ۷) کا ذکر ہے، بقیہ حصص کا اندراج صفحہ ۷۴ پر نمبر ۱۵۲۷ تا ۱۵۳۵ پر ہے۔ اس کتاب کا مکمل عنوان

لکھنا چاہیے ''المصنف فی الاحادیث والآثار''۔

- صفحہ۳، نمبر۵۳: رسم الخط ہندی نہیں ناگری لکھا جائے۔

- صفحہ۳ تا۵ 'بیاض' کا ذکر ہے۔ 'بیاض' کے عنوان سے مزید اندراج صفحہ۷، ۱۰ تا۱۲ پر ہے۔ انھیں ایک جگہ کیا جاسکتا تھا۔

- صفحہ۵، نمبر۹۵: ''تاج المصادر'' عربی میں نہیں بلکہ ترکی میں ہے اور اس کا مصنف ''مجہول الاسم'' نہیں جیسا کہ کیٹلاگر نے لکھا ہے۔ مصنف کا نام ''میر عیسی اوغلی'' ہے۔

- صفحہ۵، نمبر۹۶: عنوان میں ہی ''......تحریر انگریزی'' لکھا ہے لیکن زبان کے خانے میں 'اردو' لکھا ہے؟؟؟ یہی کیفیت نمبر۱۰۳ پر ہے جہاں عنوان میں ''چیٹھی......انگریزی'' لکھا ہے اور زبان کے خانے میں 'اردو' درج ہے۔ اس کا اندراج بھی صحیح نہیں کیونکہ عنوان میں اسے 'مطبوعہ' لکھا ہے۔ یہ فہرست 'مخطوطات' کی ہے۔

- صفحہ۵، نمبر۱۰۱: عنوان میں ہی لفظ 'فارسی' لکھا ہے ''تنبیہ الدہاقین (فارسی)'' لیکن زبان کے خانے میں 'اردو' درج کیا گیا ہے؟؟؟

- صفحہ۵ تا۷، نمبر۱۱۰ تا۱۳۳: یہ سارے انگریزی زبان میں لکھے خطوط ہیں۔ عنوان میں بھی لفظ 'انگریزی' کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن زبان کے خانے میں 'اردو' لکھا گیا ہے؟؟؟

- صفحہ۷، نمبر۱۴۱: عنوان میں ہی مصنف کا نام لکھا ہے ''رسالہ صرف (زنجانی)'' لیکن مصنف کے خانے میں ''مجہول الاسم'' لکھا گیا ہے۔ این چہ بوالعجبیست؟ مصنف کا نام ''عبدالوہاب بن ابراہیم الزنجانی'' ہے۔

-صفحہ۸، نمبر۱۴۶: ''رسم الخط ہندی'' لکھا ہے جبکہ 'رسم الخط ناگری'' ہونا چاہیے۔

-صفحہ۸، نمبر۱۴۹ تا۱۵۳: شرح جامی علی الکافیہ، شرح کافیہ، شرح ملا جامی اور فوائد الضیائیہ- یہ سبھی ایک ہی کتاب ہیں جنھیں علاحدہ علاحدہ صفحوں اور نمبروں پر اندراج کیا گیا۔

(مزید دیکھیں نمبر۱۰۰۳۶ تا۱۰۰۴۶)۔ ان سب کا اندراج ایک جگہ ہونا چاہیے۔ شرح کافیہ اور شرح ملا جامی (نمبر۱۵۱ تا۱۵۳) کے مصنف کے خانے میں ''مجہول لاسم'' لکھا ہے۔ اس کے مصنف عبدالرحمن جامی ہیں۔

- صفحہ۸، نمبر۱۵۸: ''فرمان اورنگزیب......'' صرف ایک فرمان کا یہاں ذکر ہے جبکہ بقیہ۲۲ فرامین کا ذکر نمبر۹۸۷۹ تا ۹۹۰۰ پر ہے۔ سبھوں کو ایک جگہ ہونا چاہیے۔

- صفحہ۸، نمبر۱۵۹: ''فصول اکبری'' کے مصنف کے خانے میں ''مجہول الاسم'' اور زبان کے خانے میں 'عربی'' لکھا گیا ہے جبکہ دونوں اطلاعات غلط ہیں۔ اس کے مصنف ''سید علی اکبر الہ آبادی'' ہیں اور اس کی زبان 'فارسی'' ہے۔ اس کتاب کے مزید سات نسخے صفحہ۴۳۳ کے نمبر۹۹۶۶ تا۹۹۷۲ پر مندرج ہیں۔

- صفحہ نمبر۹، نمبر۱۶۷ تا۱۶۸: ''مختصر تذکرۃ السویدی''۔ مکمل عنوان ہے ''مختصر تذکرۃ الامام السویدی''۔

- صفحہ۱۰، نمبر۱۸۸: مکمل عنوان اس طرح ہے ''ملاک التاویل القاطع بذوی الالحاد والتعطیل فی توجیہ المتشابہ اللفظ من آیۃ التنزیل'' اور مصنف کا نام ''......ابن الزبیر النجوی'' نہیں بلکہ ''......ابن الزبیر النحوی الاندلسی'' ہے۔

- صفحہ۱۰، نمبر۱۹۷-۱۹۸: ''آثار محشر'' ایک ہی نسخہ (عبدالحیی ۶۴/۲۴۴) لیکن اوپر نیچے اس کا اندراج، ایک کی زبان عربی دوسرے کی زبان اردو؟ اسی صفحے پر ایسی کئی مثالیں ہیں۔ نمبر ۲۰۰-۲۰۱ (آداب السلاطین؛ عبدالحیی ۱۲/۱۰۷) عربی زبان کے

ذیل میں بھی اندراج اور فارسی کے ذیل میں بھی۔ نمبر ۲۰۲-۲۰۳ (آداب الصالحین؛ عبدالحیی ۱۳/۱۷)۔ تقریباً ۲۰۰ سے زائد ایسی تکرار کی مثالیں پورے کیٹلاگ میں بکھری پڑی ہیں۔

محولا بالا کمیوں اور خامیوں کی روشنی میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ ''قیاس کن زگلستان من بہار مرا''۔ دس صفحات میں اگر ساٹھ کمیاں اور خامیاں ہو تو اس تناسب سے ۶۴۸ صفحات پر مشتمل اس کیٹلاگ میں تقریباً ۲۵۰۰ کمیوں/ خامیوں کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ کیا ان حقائق کی روشنی میں اسے کامل اور صحیح کیٹلاگ قرار دیا جاسکتا ہے؟

واضح ہو کہ لائبریری سائنس کے مطابق مخطوطات کی فہارس کا شمار کتب مراجع میں کیا جاتا ہے۔ اور کتب مراجع کسی بھی تحقیقی کام کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیا کسی تحقیق کی بنیاد اس کیٹلاگ کی بنیاد پر رکھی جاسکتی ہے؟

خشت اول گر نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

مناسب یہ تھا کہ اس کیٹلاگ کی اشاعت سے قبل ماہرین مخطوطات کے پاس تبصرے کے لیے اسے بھیجا جاتا، اس کے بعد اس کی اشاعت ہوتی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ فہرست علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع ہوئی ہے جسے علمی دنیا میں ایک مقام حاصل ہے۔ اس سے قبل اسی مولانا آزاد لائبریری کے مخطوطات کی فہرستیں شائع ہو چکی ہیں (۲۹ فہارس کی تفصیلات اس مقالے کے آغاز میں دیکھیں)۔ اگر انہیں فہارس کو اپنے سامنے رکھتے، جو ماہرین مخطوطات کی تیار کردہ ہیں، تو یہ فاش غلطیاں نہ ہوتیں، اور نہ ہی علمی دنیا میں شرمسار ہونا پڑتا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد بالخصوص شیخ الجامعہ سے گذارش ہے کہ وہ اس فہرست کی فروخت پر پابندی لگائیں اور اسے پبلیکیشنز ڈویژن سے واپس لینے کا حکم صادر فرمائیں، اور ماہرین کے پاس بھیج کر اس کی اصلاح کرائیں، اس کے بعد اس کی اشاعت کریں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اشاعت شدہ کتب کو واپس لینے کی ایک روایت رہی ہے مثلاً یہ روایت مشہور ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر محمد حبیب نے امیر خسرو کی فارسی تصنیف ''خزائن الفتوح'' کا انگریزی ترجمہ کیا تھا جو ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ فارسی کے ایک عظیم محقق حافظ محمود شیرانی نے اس پر ایک تبصرہ کیا جو اورینٹل کالج میگزین، لاہور میں چار قسطوں (نومبر ۱۹۳۵ء، فروری ۱۹۳۶ء، مئی ۱۹۳۶ء اور اگست ۱۹۳۶ء) میں شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے اس ترجمے کو غلط قرار دیا تھا اور اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے شرمناک قرار دیا تھا۔ ان کے تبصرے کی اشاعت کے بعد اس ترجمے کی اشاعت اور فروخت پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ اسی طرح ''علی گڈھ تاریخ ادب اردو'' جو پروفیسر آل احمد سرور کی ادارت میں تیار کی گئی تھی اور ۱۹۶۲ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ رشید حسن خاں نے اس کتاب پر تبصرہ کر اس کی کمیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی اور اس کی اشاعت کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے شرمناک بتایا تھا (ماہنامہ 'تحریک'، دہلی، اکتوبر ۱۹۶۳ء)۔ لہٰذا اُس وقت کے شیخ الجامعہ کی ہدایت پر اس کی فروخت پر پابندی لگائی گئی اور فروخت شدہ نسخے بازار سے واپس لیے گئے۔ محولہ بالا مثالوں کی روشنی میں ''فہرست مخطوطاتِ مولانا آزاد لائبریری'' کی فروخت پر بھی پابندی لگا کر اسے بازار سے واپس لیا جائے۔ اور اسے ماہرین مخطوطات سے درست کرا کے دوبارہ منظر عام پر لایا جائے۔

☆☆☆

آغا حشر کاشمیری اور ڈرامہ نگاری

غلام علی اخضر

ڈرامہ نگاری کے میدان میں ایک سے ایک بڑھ کر اشخاص اپنے ہنر سے نام پیدا کیے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ڈرامہ نگاری امز ور کے تقاضے کے تحت نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کا رشتہ اس سے ٹوٹتا گیا، جس سے ان کے نام اور ڈرامے کتابوں کے اوراق میں اپنی قدیم خصوصیت کے ساتھ ضم ہوکر رہ گئے۔ ڈرامہ انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ انسان اس وقت بھی ڈرامے سے وقت گزاری کرتا تھا؛ جب وہ تہذیب وتمدن سے عاری تھا۔ جنگلوں میں آگ جلا کر طرح طرح سے ناٹک اور کرشمے دکھاتا، اور یہ ان کے لیے وقت گزارنے کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈرامہ کی ابتدا 'یونان' سے ہوا، مگر ڈرامے کو پیشہ وارانہ روپ اور فن کی حیثیت سے استعمال پہلے یورپ نے کیا۔ یونان کیوں کہ دیوی دیوتاؤں کے پہلے پرستار تھے اور وہ ان ڈراموں کے ذریعے اپنی دیوی دیوتاؤں کے قصے کو محفل میں لوگوں کو جمع کر کے پلے کر کے دکھاتے اور سناتے۔؛ اس سے ان کا مذہبی کام ہوتا تھا۔ جب مغربی ممالک نے ڈرامے کی طرف قدم بڑھایا تو اب ڈرامہ مذہبی محدود دائرے سے نکل کر فن کی حیثیت اختیار کرنے لگا۔ یہاں یہ بات ضرور ہے کہ مغربی ممالک نے ایک حد تک یونانیوں کی تقلید کی۔ رہا ہندوستان تو ڈرامے کے نمونے مہابھارت میں ملتے ہیں۔ پھر یہ کہ جدید تحقیق سے یہ بات بھی اجاگر ہوئی ہے کہ سنسکرت میں سب سے پہلے بھاش نے چوتھی، پانچویں قبل مسیح ڈرامہ نگاری کا آغاز کیا تھا۔ یہاں یہ بات بھی واضح کردوں کہ ہندوستان میں ڈرامے کے معاملے میں وہ تقلید نہیں کی گئی جو یورپ نے یونان کا کیا۔

یہاں ڈرامے کے آغاز وارتقا کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کرنے کی گنجائش نہیں۔ کیوں کہ موضوع ''آغا حشر کاشمیری اور ڈرامہ نگاری'' ہے، تو ظاہر ہے کہ ہم یہاں زیادہ سے زیادہ موضوع گفتگو کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے، مگر بہتر اور مناسب ہے کہ اس سے پہلے اردو ڈرامے کا آغاز کے حوالے سے کچھ اجمالی طور پر نظر ڈالتے ہیں تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ آغا حشر سے پہلے اردو ڈرامہ نگاری کی کیا صورت تھی۔ اس ضمن میں یہ بات بھی خلاصہ ہوجائے گا کہ آغا حشر کے اردو ڈرامے کی دنیا میں آمد سے کیا گل بوٹے لگے، کس نہج پر ترقی کے مدارج طے ہوے اور اس نے قدو منزلت میں کیا مقام حاصل کیا۔ اس حوالے سے کہ اردو ڈرامے کا یا یوں کہیں کہ ہندوستان میں اردو ڈرامے کا آغاز کہاں سے اور کس طرح ہوا، تو امتیاز علی تاج رقم طراز ہیں:

''موجودہ دور میں اردو ڈرامے نے ہندوستان کے نواب واجد علی شاہ کے قصر باغ کی چار دیواری میں جنم لیا۔ اس زمانے میں اتفاق سے ایک فرانسیسی کو دربار اودھ میں بار یابی حاصل ہوگئی۔ رنگیلے پیا کے لیے انوکھی تفریح بہم پہنچانا درباریوں کے لیے ایک مستقل مسئلہ بنا رہتا تھا۔ فرانسیسی کو اس کا علم ہوا تو اس نے یورپ کے تفریحی ڈرامے کا ذکر کیا۔ چناں چہ پہلے پہل اردو میں جو ناٹک کھیلا گیا وہ خالص اوپیرا تھا۔ اس کا نام اندر سبھا تھا اور اسے سید آغا امانت لکھنوی نے لکھا تھا''۔

یہاں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ اردو ڈرامے کی ابتدائی نشوونما کا تعلق ''رادھا کنہیا'' سے ہے جو ہندوستان کا پہلا ڈرامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس کو واجد علی شاہ نے ترتیب دیا تھا، لیکن ایک ڈرامے میں جو بات ہونی چاہیے؛ اس میں نہیں تھی، جو سید آغا امانت لکھنوی کے ڈرامے میں آئی۔ اس لیے اردو میں باضابطہ ڈرامے کا آغاز آغا امانت لکھنوی سے مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد کئی شخصیات نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ امانت کے ڈرامے کا وہ جادو چلا کہ اس دور میں نہ جانے کتنے اندر سبھا کے نام سے ڈرامے وجود میں آگئے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس زمانے میں ہر ڈرامے کو اندر سبھا سے ہی پکارنے لگے۔ جہاں کہیں ڈرامہ چلے ہوتا تو لوگوں میں شور ہوتا کہ ''چلو اندر سبھا دیکھنے'' یہ اندر سبھا کی مقبولیت کا عالم تھا، مگر جب بات آتی ہے انڈین شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری کی تو اردو ڈرامے کو جو انھوں نے وقار و مقام بخشا، ساتھ ہی حشر کو جو عزت اور شہرت ملی وہ اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ حشر کے معاصرین میں کچھ مشہور و معروف ڈرامہ نگار کے نام یہ ہیں:

طالب بنارسی، احسن لکھنوی، بیتاب بنارسی، عباس، عبداللطیف اور شاد وغیرہ۔

ایک وقت تک حشر اپنے معاصرین کے صف میں ساتھ کھڑے رہے مگر وہ دور بھی آیا کہ وہ سب کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئے۔ اس ترقی نے انھیں اردو ڈرامے کے جہان میں لافانی بنا دیا۔

آغا حشر نے تقریباً ۳۳/سال تک ڈرامے لکھے۔ ابتدائی ڈراموں کا رخ اور انداز پیش کش وہی ہے جو معاصرین یا یوں کہیں کہ جو ہمارے یہاں روایتی انداز کے ڈراموں کا تھا۔ ان ڈراموں کا اصل مقصد عام طور سے پیشہ اور تفریح فراہم کرنا رہتا تھا۔

آغا حشر نے اپنے نوک قلم سے سب سے پہلے جس ڈرامے کو جامہ پہنایا اس کا نام ''آفتاب محبت'' ہے۔ جس کو انھوں نے 1897ء میں تحریر کیا۔ اس کے متعلق عشرت رحمانی اپنی کتاب ''اردو ڈرامے کی تاریخ اور تنقید'' میں تحریر کرتے ہیں:

''احسن صاحب کو 'چندراولی' پر بڑا ناز تھا۔ کسی صحبت میں حشر کے منھ سے نکل گیا کہ اس سے اچھا ڈرامہ میں لکھ سکتا ہوں، جو احسن صاحب کو ناگوار ہوا۔ غرضیکہ حشر نے ''چندراولی'' کے جواب میں اپنا پہلا ڈرامہ ''آفتاب محبت'' 1897ء میں لکھا اور بنارس کے ایک کتب خانے میں فروخت کردیا۔ ڈرامہ چھپا مگر کہیں اسٹیج نہ ہوا۔ منشی احسن نے اس ڈرامے کو دیکھ کر آغا صاحب پر 'بچپن کا کھیل' کی طنز کی''۔

اس طرح حشر اپنی ڈرامہ نگاری کے مشن کو شروع

کرتے ہیں۔ آغا حشر (پیدائش 1879) کے اباواجداد کشمیری تھے۔ کشمیر میں حالات کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے والد محترم بنارس آکر بس گئے۔ آغا کا گھریلو نظام مذہبی تھا۔ شاید اس لیے وہ اپنی فن کاری کی مکمل صلاحیت کو پیش کرنے میں خود کو Comfortable محسوس نہیں کررہے تھے۔ کہیں نہ کہیں گھریلو نظام انھیں کھل کر میدان میں آنے میں آڑ بن رہا تھا۔ اور پھر ممبئی میں ڈرامہ پلے کی دھوم نے انھیں گھر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ تذکرہ نویسوں نے ان کے گھر سے بھاگنے کا ایک واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ میونسپلٹی میں ملازمت کے لیے ان کے والد نے آغا حشر کے لیے بات کی جس میں کچھ رقم جمع کرنی تھی۔ حشر کے والد ان کو رقم دی مگر کسی وجہ سے وہ اس دن وہ جمع نہ ہو سکی۔ لوٹتے وقت انھوں نے دوستوں کی خاطر تواضع میں خاصی رقم خرچ کردیے۔ اب ڈر سے گھر کی جانب راہ نہ لے کر وہ اسٹیشن کا رخ کیا اور ممبئی پہنچ گئے۔ مگر کسے معلوم تھا کہ آج کا بھگوڑا کل ڈرامہ نگاری کا مجدد اعظم بن جائے گا۔ وہ ممبئی پہنچ کر ''کاوش جی'' کی کمپنی میں ڈرامہ نویسی کی خدمات انجام دینے لگے۔ آغا کی آمد نے کمپنیوں کے تجارتی میدان میں وہ بہار لائی کہ ہر کمپنی اس امید پر رہتی اور خواہش ظاہر کرتی کہ آغا ہماری کمپنی کے لیے ڈرامہ لکھ دیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ آغا حشر ڈرامے کے میدان میں اپنی انفرادیت اور صلاحیت کی وجہ سے اگلوں اور پچھلوں کے امام ہیں تو کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگا۔

قارئین آنے والی عبارت سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ آغا حشر کا ڈرامہ کس قدر پُرکشش تھا اس میں جادوگیری کا کیا عالم تھا:

''میڈن تھیٹر کمپنی کے ایک مشہور ایکٹر محمد طفیل صاحب کے چچا نے آغا صاحب کی مقبولیت کا حال بیان کرتے ہوئے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جس کمپنی میں کام کرتا تھا اس کی مالی حالت کئی مہینے سے بہت خراب تھی۔ آغا صاحب کمپنی میں آئے تو سب سے پہلے ڈراما ''سلور کنگ'' اسٹیج پر پیش ہوا۔ اس کھیل کو اتنا پسند کیا گیا کہ وہ لگاتار ساتھ مہینے تک چلتا رہا۔ اور کمپنی کو اتنی آمدنی ہوئی کہ ملازموں کی تنخواہوں کے علاوہ الاؤنس بھی ملنے لگے۔ ایک شو کی آمدنی ملازمین میں تقسیم ہوئی۔ اس کھیل سے کمپنی کی شہرت بہت پھیل گئی''۔

آغا حشر کاشمیری نے اپنے فنی کمال سے ایک تاریخ رقم کی۔ اس تاریخ نے جہاں ڈرامے کو بیش قیمت خزانہ عطا کیا وہیں ان ڈراموں نے آغا کو بھی لوگوں میں مقبول عام کردیا اور ساتھ ہی حشر کی خوبی سے آگاہی بھی۔

مزید حشر کے ڈرامے کے حوالے سے گفتگو کرنے سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کی ڈرامہ نگاری دور کا جائزہ لیں تاکہ مزید معلومات اور بات کی سمت بہتر ثابت ہو۔ یہاں پروفیسر وقار عظیم صاحب کی کتاب ''اردو ڈرامہ فن اور منزلیں'' جس میں وہ بحوالہ مضمون '' آغا حشر کا فنی ارتقا'' عشرت رحمانی کے حوالے سے بات کرتے ہیں، پیش ہے:

''پہلا دور 1901 سے 1905 تک، اس دور میں مرید شک، مار آستین، میٹھی چھری اور اسیر حرص لکھے گئے۔

دوسرا دور 1906 سے 1909 تک، اس دور میں شہید ناز، خوبصورت بلا، سفید خون اور صید ہوس لکھے گئے۔

تیسرا دور 1910ء سے 1916ء تک، سلور کنگ، خواب ہستی، یہودی کی لڑکی، سورداس، بن دیوی اور پہلا پیار اس دور کے مشہور ڈرامے ہیں۔

چوتھا دور 1917ء سے 1924ء تک، یہ کلکتہ کے قیام کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں آغا صاحب نے زیادہ تر ہندی کے ڈرامے لکھے۔ مدھر مرلی، بھاگیرتھ گنگا، بھار رمنی (قیدم بن دیوی ہندوستان جس کے تین حصے ہیں: شرون کمار، اکبر اور آنچ) آنکھ کا نشہ، پہلا پیار اور بھیشم اس دور کی یادگار ہیں''۔مزید سیر کی گرج، ترکی حور وغیرہ بھی اس دور کے ہیں۔

آغا حشر جہاں اپنے ڈراموں سے عوام کی تشنگی بجھانے کا کام کررہے تھے وہیں انھوں نے اصلاح معاشرہ میں بھی اہم کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ماقبل میں یہ بات بیان ہوچکی ہے کہ آغا حشر کے شروع کے ڈراموں کا حال وہی تھا جو اس دور کے ڈراموں کا تھا مگر آغا کے یہاں تبدیلی روز بروز ترقی کے ساتھ ہوتی رہی۔ اس لیے بعد کے ڈرامے بدلتے انداز اور انفرادیت میں انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ آغا حشر ڈرامے کو صرف تفریحی فن تصور نہیں کرتے بلکہ وہ اس کے ذریعے سماج کو بیدار رکھنا اور اس میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ اس لیے بعد کے ڈراموں میں اصلاحی جذبہ زیادہ حاوی ہے۔ اس دور میں سیتا بن باس (1928ء) رستم و سہراب (1929ء) مزید اس کے بعد دھرمی بالک، بھارتی بالک، دل کی پیاس، فرض عالم، ٹاکیز میں شریں فرہاد، عورت کا پیار، چندن داس بھیشم کو حشر مکمل نہ کرسکے۔ ان کے ڈراموں میں کشمکش کا عالم چھپا رہتا ہے۔

حشر بلا کے مناظر بھی تھے۔ انھوں نے اچھے معاصرین بھی پائے اور اچھے دوست بھی۔ وہ آزاد کے اچھے ساتھی تھے۔ وہ جس زمانے میں بمبئی میں تھے مولانا ابوالکلام آزاد ساتھ رہتے، اگر حشر اپنے قلم اور خداداد قوت وذہانت سے ڈرامہ کو شکل وصورت اور وجود بخشتے تو مولانا اپنے بے باک قلم سے صحافت کے کام کو انجام دیتے۔ کئی بار پارسیوں کے ساتھ مناظرے میں مولانا کے ساتھ رہے اور بہت سارے موقعوں پر تو آغا حشر ہی مناظرہ میں فتح کے ضامن ہوے۔ مزید معلومات کے لیے پڑھیں ''آغا حشر سے دو ملاقاتیں'' (از: منٹو)

آغا حشر نے جہاں بازار کی دنیا میں قدم رکھا وہیں معاشرے کو ہر آن نگاہ میں بھی رکھا۔ ان کی جدت طرازی اور بے لوث خدمت کی وجہ سے ان کو ارباب فن نے اردو کا شیکسپیئر کہا۔ 1813ء میں آغا حشر کو دہلی میں ایک عوامی استقبالیہ دیا گیا جس میں انھیں ''انڈین شیکسپیئر'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ یوں تو بہتوں کو یہ خطاب حلق سے نیچے نہیں اترتا مگر ایک دنیا انھیں اردو کا شیکسپیئر جانتی اور مانتی ہے۔ وقتاً فوقتاً بہت غالب شکن وجود میں آئے مگر غالب ہمیشہ غالب ہی رہے۔ اسی طرح آغا کے قدر یا شیکسپیئر کے خطاب سے اتفاق نہ رکھنے والے ہوئے مگر قدر میں کچھ فرق نہیں آیا۔ وہ آج بھی اپنی شہرت کی کائنات میں اپنی قدر آور ہستی سے قیامت بپا کیے ہوئے ہیں۔ اسی فتنۂ قیامت سے بہت کے جی خوش ہوے تو بہتوں اپنی قابلیت کی انا میں بھٹک گئے۔ یہاں ''آغا حشر کاشمیری عہد اور ادب'' کی تحریر سے اس بات کی پردہ کشائی کی جارہی ہے کہ حشر کے ڈرامے سماج کو کس

قدر بیدار کیا۔ سید محمد اسماعیل لکھتے ہیں:

''آغا حشر نے تاریخی، سماجی، اصلاحی اور ہر طرح کے ڈراموں کو اپنا موضوع سخن بنایا اور آخری دور میں شراب ،جہیز اور حسن بازاری کی لعنت کو اپنے ڈراموں کا موضوع بنایا۔ جس موضوع کو ہاتھ لگایا، جاودان بنایا۔ یہ تینوں موضوع بلاشک سماج کے اصلاح طلب پہلو ہیں۔ اور یہ تینوں وبائیں سماج میں اپنا زہر گھول رہی تھی۔ ہر امیر و غریب ان وباؤں میں بتلا تھا۔ چوں کہ ڈراما اس وقت کی تفریح کا اہم شوق تھا اس لیے آغا حشر کی نباض نگاہ ڈرامے کے ذریعے ان وباؤں کا علاج کیا۔ انھیں سماج کی اصلاح کے لیے اس سے اچھا ہتھیار نہ دکھائی دیا۔ ڈراموں کا اثر ناظرین و سامعین پر اتنا تیز تر ہوا کہ لاکھوں نے شراب پینی چھوڑ دی۔ کوٹھوں پر جانے والوں نے توبہ کرلی اور جہیز کی وبا آج بھی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ اور آج بھی ان ڈراموں کا سامعین پر اتنا گہرا اثر ہوتا ہے جس کا جواب نہیں''۔

حشر کے ڈراموں میں وہ قوت تھی کہ لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ اور تذکرہ نویسوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ان کے ڈرامے کو دیکھنے کی غرض سے بہت سے حضرات تو گھروں کے، بیبیوں، بچوں اور بہو کے سامان تک بیچ ڈالتے تھے۔ یقیناً یہ جادوئی کرشمہ کوئی عام ڈرامے سے پیدا نہیں ہوسکتا بلکہ اعلیٰ ڈرامے ہی سے یہ کرامت ظہور پذیر ہوسکتی ہے۔

ماقبل میں یہ بات گزری ہے کہ حشر کو ہندوستانی شیکسپیئر ماننے میں اختلاف ہے اور ہونی بھی چاہیے کیوں کہ سب کی اپنی اپنی دلیل ہے اور پھر یہ کہ اختلاف سے بات میں نیکھار پیدا ہوتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ یہ اختلاف اختلافِ رائے یا نظریے تک ہی رہے مخالفت نہ ہو جو عام طور سے شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ہندوستان شیکسپیئر سے اتفاق نہ رکھنے والوں میں ایک نام ڈاکٹر مسیح الزماں کا ہے وہ لکھتے ہیں:

''شیکسپیئر نے انسانی نفسیات کی جو تصویر پیش کی ہیں کرداروں کو تراش کر ان کے جس طرح رنگارنگ جلوے دکھائے ہیں، ذہن و فکر کی جس باریکیوں کو جس صورت سے بے نقاب کیا ہے، اس کا آغا حشر کے یہاں پتا نہیں''

پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب اس حوالے ایک تحریر کوٹ کرتے ہیں:

''کسی نے صحیح لکھا ہے کہ

اردو ڈراما نگاری میں آغا حشر کی یہ اہمیت خاص کر اس وجہ سے ہے کہ وہ ہمارے ادب میں ایک ہی ڈراما نگار ہوئے ہیں جنھوں نے ڈراما نگاری کو مستقل شغل کی حیثیت سے اختیار کیا اور اپنے دور کی حدود میں اس شغل کے تمام تقاضوں کو پورا کیا۔ اس سلسلہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ آغا حشر نے ڈرامے کو ایک علمی وسیلۂ اظہار کے طور پر برتا۔ انھوں نے اپنے فن کو ہمیشہ زندگی سے مربوط رکھا، اس کی اپیل محدود رکھنے کی بجائے زیادہ وسیع کرنے کی کوشش کرتے رہے'' (آغا حشر کاشمیری عہد اور ادب)

نہ جانے ہمارے یہاں یہ ضد کیوں چڑھی رہتی ہے کہ اگر کسی کو مثال کے طور پر دورِ حاضر کا غالب کہہ دیا جائے تو تنقیدی مزاج حضرات انھیں خصوصیات کو سو فیصد تلاش

کرنے لگ جاتے ہیں جو واقعی غالبؔ کے اندر تھیں- حالاں کہ یہ عجیب بات ہے- ہر دور میں اپنے اعتبار سے کچھ بلند خیال حضرات ہوتے ہیں جو اپنے عہد میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں، جس کی وجہ سے جو جس میدان میں کام کر رہا ہے اس سے تعلق رکھنے والی ہستیوں کے نام یا القاب کے ساتھ باشعور انسان ان کے کارنامے اور اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی وجہ سے پکارنے لگے ہیں۔

شیکسپیئر نے زندگی کے مقصد کو فن سے اور فن کو زندگی سے جوڑ کر دیکھا اور چلنا سکھایا تھا اسی کی پیروی کرتے ہوئے آغا نے بھی اپنے ڈرامے سے انسانی نفسیات کی نبض پر ہاتھ رکھنے کا کام کیا اور سماج کو صحیح سمت میں پھیرنے کی کوشش کی۔ اس لیے اردو کے حوالے سے ہم آغا حشر کو انڈین شیکسپیئر یا اردو کا شیکسپیئر کہتے ہیں۔ ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شیکسپیئر نے جو اپنی تحریر یا ڈرامے کے ذریعے جو کام کیا وہ آغا کے یہاں کما حقہ نہیں ہے مگر پھر بھی اردو میں اردو ڈرامے کے حوالے سے ڈراما نگاری میں ان سے بہتر نہ نظر آنے کی وجہ سے بغیر چوں چرا آغا حشر کو اردو کا شیکسپیئر تسلیم کرتے پر راضی ہیں۔

حشر نے جہاں طبع زاد ڈرامے تحریر کیے وہی انھوں نے انگریزی ڈراموں کو ترجمے کا لباس پہنا کر اردو داں طبقے کو انگریزی ڈراموں کے لذت سے سرشار کیا۔ شیکسپیئر کے کئی ڈراموں کو اردو کے قالب میں ڈھالا، جس سے اردو کا دامن ادبی سرمایے سے مالا مال ہوا۔ یقیناً اردو داں طبقے کے لیے ڈرامے کے پیش نظر یہ خدمت قیمتی ہے۔

آغا حشر سے قبل یا اس دور کے ڈراموں پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ نظم کی صورت کے ساتھ مسجع و مقفیٰ بوجھ تلے دبے ہوے ہیں اور یہی ذوق سلیم کے ساتھ عوام الناس میں معزز ہے ساتھ یہ بھی کہ مزاحیہ حصہ عامیانہ پن کا شکار ہے۔ حشر نے ڈرامے کو نئی جہت عطا کی۔ وہ ادبی اور تفریحی دونوں اعتبار سے ڈرامے کو قدر بخشا۔ حشر میں ایک بات جو کمال کی تھی وہ یہ کہ اسٹیج پر ڈرامے کو پلے کرنے سے پہلے ان افراد کو سناتے جو عوام سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو جب ڈرامہ اچھا لگتا تب وہ ڈرامے کو اسٹیج پر پلے کراتے۔

حشر اچھے شاعر بھی تھے، اس لیے ان کے ڈراموں میں شاعری اپنی صفائی کے ساتھ طواف کرتی رہتی ہے۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں مسجع مقفیٰ انداز کو عباراتی شکل دے کر ان میں ادبی شان کو بلند کیا مگر آیئے مزید اس کو بہتر سمجھنے اور جاننے کے لیے ''اردو ڈامہ فن اور منزلیں''میں سے ایک تحریر کا مطالعہ کرتے ہیں:

حشر کو اپنی ڈراما نگاری کے پہلے دوسرے دور میں ایسے لوگوں کے مذاق کی تسکین کرنی تھی جو خون ناحق جیسے ڈراموں کے دلدادہ تھے۔ ایسے ڈرامے جن میں گانوں کی بھرمار ہو، جن میں کردار نثر کے بجائے شعر میں گفتگو کریں اور اگر بھولے سے نثر بولیں تو وہ مقفیٰ اور مسجع ہو۔ چناں چہ ڈرامے جو حشر نے اس زمانے میں لکھے انھیں خصوصیات کے حامل ہیں، لیکن ایک چیز ان ڈراموں میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے اور وہ یہ کہ گانوں کے استعمال میں اور مکالموں میں اشعار اور مقفیٰ و مسجع عبارت سے کام لیتے وقت انھوں نے خاصی حد تک اعتدال اور توازن برتا ہے۔ گانوں کی تعداد ۶۰/۵۰/۴۰ رکے بجائے ۲۲/۲۰ رہے۔ مکالموں میں

شعروں کا استعمال نثر کے ساتھ ملا جلا ہے۔ کردار نثر میں کہی ہوئی بات کو شعر کے ذریعے زیادہ موثر بناتا ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ جو کچھ اس نے نثر میں کہا ہے شعر اس کی تائید کرتا ہے۔ قافیہ پیمائی میں بھی ڈراما نگار نے مکالمے کو حتی الامکان روز مرہ کی زبان سے قریب رکھا ہے۔ عام بول چال کے سیدھے سادے لفظوں ہی سے قافیہ کے آہنگ اور جھنکار کا کام لیا ہے''

ریوتی شرن شرم کے ایک مضمون میں ہے:

''1897ء سے 1932ء کے درمیان تقریباً 27 ڈرامے لکھ کر آغا حشر نے فن ڈراما کو وہ جلا بخشی اور اس میں ان عناصر کو داخل کیا، جن کی وجہ سے وہ ڈرامے کی نقادوں کی توجہ اور آج تھیٹر ڈائریکٹرس کی دل چسپی کا مرکز بنے۔''

آغا حشر کو مزاحیہ ڈارمے سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ درمیان میں کہیں مزاحیہ بات آجائے مگر مستقل مزاحیہ تو ایسا نہیں ہے۔ سعادت حسن منٹو'' آغا حشر سے دو ملاقیں'' کے ضمن میں لکھتے ہیں:

......آغا صاحب جب خاموش ہوئے تو پنڈت محسن نے ان سے کہا'' آغا صاحب آپ کی طبیعت موزوں ہے میں کاغذ قلم لاتا ہوں۔ آپ کامیڈی لکھوانا شروع کر دیجیے''۔ یہ مضمون کافی دل چسپ ہے۔ پھر یہ کہ منٹو کے قلم سے نکلا مضمون دل چسپ نہ ہو یہ ہو سکتا ہے! اب آپ ملاحظہ کریں کہ وہ کس انداز سے آغا حشر کے جوابی نقشے کو پیش کرتے ہیں:

'' آغا صاحب کی ایک آنکھ بھینگی تھی۔ آپ نے اسے گھما کر کچھ عجیب انداز سے پنڈت جی کی طرف دیکھا'' اے چپ کر آغا کی طبیعت ہر وقت موزوں ہوتی ہے''۔ پنڈت جی خاموش ہو گئے اور اپنی گڑگڑی گڑگڑانے لگے''

اس گفتگو میں اجمالاً یہ بھی بتا تا چلوں کہ آغا حشر کاؤش جی کی کمپنی کے علاوہ شیر دادا بھائی، نیو الفریڈ، حیدآباد میں خود کی قائم کردہ کمپنی، پھر لاہور میں انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی قائم کی؛ وغیرہ کے لیے ڈرامے لکھے۔

بہر حال یہ طے ہے کہ آغا حشر نے اردو ڈرامے کو ایک نیا انداز، پیش کش میں انفرادیت اور ڈرامہ نگاری کو سماجی تصویر بنایا۔

آغا نے 28 اپریل 1935ء کو لاہور میں انتقال کیا اور میانی (لاہور) صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

☆☆☆

ماضی کے دریچے سے

سرسید کی وفات پر ریاض الاخبار گورکھپور کا اداریہ

پروفیسر اصغر عباس

انیسویں صدی کے اواخر میں گورکھپور اردو صحافت کا اہم مرکز بن چکا تھا۔ یہاں سے متعدد اخبارات شائع ہوتے تھے ان میں ''الوقت'' کے قارئین کا حلقہ خاصا وسیع تھا اس کے ایڈیٹر احسان اللہ عباسی تھے اسے ٹائمز کے نمونے پر نکالا گیا تھا۔ احسان اللہ علی گڑھ کالج کے اردو سیکشن کے پہلے بیچ کے طالب علموں میں تھے۔ پہلی بار جب ترکی کے سفیر علی گڑھ کالج آئے تو احسان اللہ عباسی نے انھیں عربی میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے ان کا استقبال کیا تھا۔

گورکھپور کا دوسرا اخبار حکیم برہم کا ''اخبار مشرق'' تھا جسے انگریزی کے 'پائنیر' کے مقابلے میں رکھا جاتا تھا۔ یہاں کا تیسرا اہم اخبار ''ریاض الاخبار'' تھا جسے ریاض خیرآبادی شائع کرتے تھے اس کے پروپرائٹر حافظ نظام احمد تھے۔ کوئن وکٹوریہ کی جبلی کے موقع پر اسے ہفتہ میں دوبار کر دیا گیا لیکن رسالہ اردو میں اپنے مضمون ''آدھی صدی پہلے کے اردو اخبارات'' میں مولوی عبدالرزاق راشد لکھتے ہیں کہ شروع میں ''ریاض الاخبار'' سولہ صفحے کے حجم کے ساتھ ہر دسویں روز خیرآباد سے نکلتا تھا۔ یہ پہلی بار ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر گورکھپور کے مرتب ایچ آر نیویل کیا بیان ہے کہ ریاض الاخبار ۱۸۸۱ء میں پہلی بار شائع ہوا۔

جنوری ۱۸۹۸ء کا ریاض الاخبار گورکھپور میرے پیش نظر ہے۔ اخبار ہر مہینہ کی یکم۔۴۔۸۔۱۲۔۱۶۔۲۰۔۲۴۔ اور ۲۸ کو شائع ہوتا ہے یہ شعر بھی سرورق کی زینت ہے:

ترا اٹھان ترقی کرے قیامت کی
ترا شباب بڑھے عمر جاوداں کی طرح

اس اخبار کے ساتھ ساتھ دوانچ کا ایک اخبار فتنہ اور عطر فتنہ بھی شائع ہوتا تھا۔ اس کے صفحات موسم کے اعتبار سے لال، پیلے، دھانی، پیازی وغیرہ ہوتے تھے۔ اپنے زمانے میں اس کے چاہنے والے بہت تھے۔

ہفتہ وار اخبار ''الوقت'' ہفتہ وار مشرق اور سہ روزہ ''ریاض الاخبار'' گورکھپور ہی کے نہیں برصغیر کے اہم اخبارات میں تھے۔ ان کی جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ پریس سے نکلتے ہی ان کے مندرجات سکہ رائج الوقت بن جاتے تھے ان کے قاری کلکتہ سے پیشاور تک موجود تھے۔ حیرت ہے کہ عبدالسلام خورشید نے اپنی کتاب صحافت پاک و ہند میں مذکورہ اخبارات کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔

ریاض خیرآبادی کا معرکہ اودھ پنچ لکھنؤ سے ہو چکا تھا لیکن وہ فکری طور پر اسی حلقہ کے اسیر تھے۔ اس کے باوجود علی گڑھ تحریک کے ادبی اثرات ان کی شاعری پر نمایاں ہیں۔ یکم اپریل ۱۸۹۸ء کے ''ریاض الاخبار'' میں سرسید کی وفات پر ریاض خیرآبادی کا اداریہ ملاحظہ ہو:

یہاں رونا پڑا دو دو کا ہے آئیں آپس میں
سکستی ہے تمنا آرزو کا دم نکلتا ہے

آج دنیائے اسلام کو صرف سرسید ہی کا رونا نہیں ہے ان کے ساتھ بدنصیب قوم و کالج کا بھی۔ جو بے سایہ و یتیم نظر آرہے ہیں۔ ان کی آئندہ حالت کچھ سنبھل کر جس کی امید نہیں تسکین کا سبب ہو تو ہو۔ مگر سرسید کا غم پائدار دوست بن کر ہر محب قوم کے ساتھ لحد تک ضرور جائے گا۔

امید بیشک زندگانی کے عمدہ اسباب میں ہے مگر افسوس ہزار افسوس سرسید کی موت سے ہمارے چہروں پر مردنی نے کچھ ایسا قبضہ کرلیا ہے کہ ہماری مردہ امیدیں نہ ہم میں جان ڈال سکتی ہیں نہ ہم مردہ امیدوں میں۔

سرسید کی موت بہت ہی ظالم موت ہے۔ جس نے سرسید کو نہیں مارا قوم کو مارا۔ قومی کالج کو مارا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سرسید کی کوششوں نے قوم کی حالت بہت کچھ بدل دی۔ ضرور بدل دی۔ ایک صدی سے بہت زیادہ مدت جس انقلاب کو درکار تھی سرسید کی سعی نے نصف صدی سے کم میں وہ بات پیدا کردی لیکن سرسید کے بعد قوم کو تو ہم کس حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ اس سے زیادہ سچی تعریف نہیں ہوسکتی کہ سرسید کا سایہ اٹھ جانے سے قوم ایک ایسے برہنہ لباس میں نظر آرہی ہے جو ستر پوش نہیں سمجھا جاتا۔ کالج ہنوز عمر طفولیت میں ہے اتنی توانائی اس میں ضرور پیدا ہوگئی تھی کہ کہا جاسکتا تھا پاؤں پاؤں چلنے کے دن نزدیک آگئے ہیں۔ افسوس سرسید اپنے آغوش پروردہ کو نوجوان دیکھنے کی حسرت دل میں لے گئے۔ کچھ شک نہیں سرسید کے مرنے سے وہ پولیٹکل طاقت بھی مرگئی جس نے اسلامی دنیا کو خواب غفلت سے بیدار کیا تھا۔ سرسید کے ساتھ قوم دفن نہیں ہوئی مگر قومی ترقیاں دفن ہوگئیں۔ کالج سرسید کے ساتھ پیوند زمین نہیں ہوا مگر طلبا کے بڑھتے ہوئے جوش ان کے آنسوؤں کی طرح خاک میں مل گئے۔ سرسید کو دنیائے اسلام مدت تک روئے گی۔ ان کے اوصاف ان کے سوانح تاریخ میں برگزیدگی کا اضافہ کریں گی ہماری بدبخت قوم مستفیض ہو یا نہ ہو اور قوم میں تاریخی جوش اثر سے ابھریں گی کہ سرسید کے اعزاز و وقعت کی وارث بنیں۔ سرسید نے قوم کی دنیاوی اعزاز کے لئے جو کچھ کیا ہم سا مخالف شکر گذار ہے۔

مذہبی طور پر جو کچھ سرسید نے کہا ہم کیا متعصب سا متعصب مخالف گروہ بھی کہہ سکتا ہے کہ توحید و رسالت پر سید کا ایمان تھا وہ پکا موحد، رسول اکرم کا سچا عاشق بالقرار کلمہ گو مسلمان اور تحقیق و تدقیق مسائل میں نیک نیتی کے ساتھ امر حق کا تلاش کرنے والا تھا۔ وسیع صحرائے تحقیق میں گو اس کا دامن کانٹوں سے الجھا ہو انسانی کمزوریوں سے اس نے ٹھوکریں کھائی ہوں، غلط فہمیوں اور خطا کاریوں میں مبتلا ہوا ہو مگر وہ قوم اسلام کو دانستہ فریب دینے والا نہ تھا۔ تمام قوم اسلام پر سرسید کی دعائے مغفرت اور سرسید کے نام کو اعزاز کے ساتھ زبان پر لانے کے لئے سرسید کا یکساں حق ہے۔

اے پروردگار عالم سرسید تیری توحید کا پرستندہ ہے تیرے پاک نبی کی نبوت پر اپنے ایمان وعقاید کو استوار رکھنے والا اور اس مٹی ہوئی قوم اسلام کی حالت پر اپنی عمر شیریں کو تلخ کرنے والا تھا تو اس پر رحم فرما اور اس کی مغفرت کر۔ آمین ثمہ آمین۔

☆☆☆

تبصرہ

نقش دوام: پروفیسر مختارالدین احمد

مرتبہ: ڈاکٹر طارق مختار

ابوالکلام قاسمی

پروفیسر مختار الدین احمد اردو اور عربی کے ایک اہم محقق، مصنف اور انشا پرداز رہے ہیں۔ علمی اور ادبی معاملات میں تحقیق اور تنقید کے شعبے الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مربوط اور لازم وملزوم کی حیثیت سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ زیر نظر کتاب کی کسی بھی تحریر کو آپ کسی نہ کسی طرح تحقیق کے خانے میں رکھنے کے باوجود تنقید کے زمرے میں شامل نہیں کر سکتے۔ جس کے اسباب گوناں گوں ہیں اور ہوسکتا ہے کہ اس کا اندازہ اس تبصرے کے آخر تک پہنچتے پہنچتے قاری کو خود ہی ہو جائے۔ مختار الدین صاحب عرصۂ دراز تک شعبۂ عربی اور شعبۂ علوم اسلامیہ کے مقتدر اور سربرآوردہ اساتذہ اور سربراہوں میں شامل رہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے عربی زبان میں تحقیقی رسالے کی اشاعت واجراء ان کی ہی مساعی کا نتیجہ ہے جس کا تسلسل آج تک قائم ہے اور جس کے مختلف شماروں میں عربی کے اساطین علم وادب بالعموم اور علی گڑھ سے وابستہ علماء کی کاوشیں بالخصوص گذشتہ دو تین دہائیوں میں بخوبی متعارف کرائی جا چکی ہیں۔

مختار الدین احمد صاحب زمانۂ طالب علمی سے ہی اپنے تحقیقی مزاج اور علمی اشتغال کے نقوش اردو کے رسائل وجرائد اور بعض تصانیف میں ثبت کرتے رہے۔ دلچسپ بات یہ کہ ان کی بیش تر تحریریں خود مکتفی کم اور تدوین، تحقیق، انتخاب اور علمی تلاش وجستجو کا ماحصل زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ زیر بحث کتاب کو ایک خود نوشت سوانح کی حیثیت سے پڑھا جائے تو اس میں مؤلف نے اپنی ذات اور اس سے وابستہ مقامی اور بین الاقوامی منظر نامہ سے متعلق کشش اور یاد رکھے جانے کے بہت سے محرکات اپنے اندر چھپا دیئے ہیں۔ مختار الدین صاحب کو علمی روابط قائم کرنے اور باقی رکھنے سے غیر معمولی دلچسپی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا علی گڑھ ہو یا آکسفورڈ، یورپی ممالک ہوں یا مشرق وسطیٰ کے ممالک ان کی بیش تر علمی اور ادبی شخصیتوں سے ان کے روابط کی جھلکیاں کثرت سے اس کتاب میں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ وہ اس سلسلے میں رسائل وکتب کی دستیابی، تبادلے اور مراسلت کے سلسلے کو تواتر کے ساتھ قائم رکھتے اور پُروقار طریقے پر ان اوسط درجے کی مصروفیات کو بھی اعلیٰ تحقیقی سرگرمی میں تبدیل کر دینے کا ہنر جانتے تھے۔ حیرت اس

بات پر ہوتی ہے کہ وہ اپنے احباب کے خطوط بڑے اہتمام سے محفوظ کرتے رہے اور اگر ان میں سے کسی کے متعلق کوئی تحریر لکھی تو حوالے کے طور پر پرانی یادوں کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے متعلقہ فرد کے بعض خطوط کے وہ اقتباسات بھی لکھ دیئے جو مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے رشتے کے استحکام کو مزید راسخ کرتے ہیں۔

نقش دوام کے تیس سے زیادہ مضامین میں تقریباً نصف تو شخصی خاکے ہیں اور باقی نصف کا تعلق یادوں کی باز آفرینی سے ہے۔ اپنے خاکوں اور یادوں کے جو عنوانات انھوں نے متعین کیے ہیں ان میں ان کی تخلیقی اور شاعرانہ شان بہت نمایاں ہے۔ مثلاً جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے، پھول کھلے ہیں گلشن گلشن، زہے روانیٔ عمرے کے درسفر گزرد اور یادوں کے چراغ وغیرہ۔ مختار الدین احمد بیسویں صدی کے سن پچاس کی دہائی میں علی گڑھ ایک طالب علم کی حیثیت سے آئے تھے، علی گڑھ میں روز اول سے ہی انھوں نے ایک متجسس اور متلاشی کی علمی زندگی گزاری، قدیم وجدید کتب، رسائل وجرائد، مخطوطات اور قدیم علمی ذخیرے ہمیشہ ان کی توجہ کا مرکز رہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ابتداء سے ہی ان کے مراسم اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ممتاز انشاپرداز، رشید احمد صدیقی تک سے قائم ہوگئے تھے۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں ان کو علی گڑھ میگزین کے مدیر کی حیثیت سے غالب نمبر شائع کرنے کا موقع ملا۔ غالب نمبر کی اشاعت ہر چند کہ ان کی ابتدائی کاوش تھی مگر انھوں نے اس نمبر میں نو دریافت تحریروں اور مطالعات غالب کے کچھ انوکھے پہلو شامل کر کے اپنا نام غالب شناسوں میں درج کرالیا تھا۔ اس کے بعد تو ان کے علمی فتوحات کا سلسلہ لگاتار جاری رہا۔ بعد کے زمانے میں کربل کتھا، گلشن چند، تذکرۂ آزردہ، دیوان حضور عظیم آبادی اور دیوان حاتم (فارسی) جیسی تحقیقی اور تدوینی خدمات نے مختار الدین صاحب کی علمی قدر و منزلت میں اضافہ کیا۔

یورپ کے زمانۂ قیام میں متعدد یورپی ممالک اور مشرق وسطیٰ بالخصوص شام کے علمی اسفار کے طفیل ان کے علمی روابط میں مزید اضافے ہوتے اور اور انھوں نے ہر ممکن مقام سے علمی ذخیرے کی فراہمی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ زیر بحث کتاب میں مولانا عبدالعزیز میمن، سرضیاء الدین، ظہیر الدین علوی، مسعود حسین خاں، جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ، ابواللیث صدیقی اور مولانا احمد رضا خاں کے شخصی جائزوں پر مبنی خاکے ہر اعتبار سے غیر معمولی اور یادگار ہیں۔ یادوں کی بازیافت کرتے ہوئے مصنف کی زندہ دلی کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور غیر معمولی حافظے کا بھی جس کا اعتراف پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی نے بھی اپنی مختصر تحریر میں کیا ہے اور ان کی متنوع دلچسپیوں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ ان معروضات کے پس منظر میں نقش دوام ایک علمی نگارخانہ اور دانش ورانہ ذخیرہ ہے جس کی اشاعت، انتخاب اور ترتیب وتدوین کے لیے ڈاکٹر طارق مختار کو جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔

☆☆☆

تبصرہ

سوانح سر سید: ایک باز دید
شافع قدوائی

ڈاکٹر فرحت جہاں

سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء۔ ۱۸۹۸ء) کی وفات پر ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا ہے، ان کی زندگی میں ان کے افکار اور تعلیمی خدمات کے متعدد اور متنوع گوشوں پر بحث وتمحیص کا جو آغاز ہوا تھا، وہ آج تک جاری ہے بلکہ اس میں مستقل اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اردو اور انگریزی کے ساتھ عربی زبان میں بھی ان کی متنوع خدمات اور بوقلموں نشاطات کے تعارف اور تعریف کا سلسلہ جاری ہے جس سے ان کی اہمیت اور معنویت کا پتہ چلتا ہے۔ مطالعات سر سید میں کسی نے ان کی تعلیمی خدمات، ادبی انتاجات اور صحافت نگاری کو موضوع بحث بنایا ہے تو کسی نے ان کی تاریخ نگاری اور دینیات کی نئی تفہیم اور تشریح پر لکھا ہے لیکن بنیادی ماخذ کی روشنی میں سر سید کے حیات وافکار کے معروضی مطالعے کم ہی نظر آتے ہیں، زیر تبصرہ کتاب میں اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس کے مصنف پروفیسر شافع قدوائی ہیں جو معاصر صحافت کی تاریخ اور تنقید کا ایک معتبر نام ہے اور سر سید کی صحافت پر ان کی تحریریں اعتبار اور استناد کا درجہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے مطالعے کے دوران جب حیات سر سید کے معاصر مصادر خاص طور پر اردو، فارسی اخبارات وجرائد کا باریک بینی، تحقیقی اور معروضی نقطۂ نظر سے مطالعہ شروع کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے سر سید کی مفصل اور معروف سوانح حیات ''حیات جاوید'' میں سر سید کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ان میں سے بعض معلومات، بیانات اور اندراجات تحقیق کے محتاج ہیں، جس کی طرف ابھی تک توجہ نہیں دی جا سکی ہے، قدوائی صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے عقیدت ومحبت کی بوجھل فضا میں اور عظمتوں کی متلاشی دنیا میں بھی علمی اور معروضی مطالعے کا چراغ روشن کیا ہے، امید ہے کہ اس چراغ سے اور بھی چراغ جلیں گے۔

مصنف کا خیال ہے کہ سر سید شناسی کے دوران سر سید کی سوانح سے متعلق مولانا حالی کے بیانات کو آخری صداقت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا اور دیگر معاصر شہادتوں اور ماخذ کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا جس کی وجہ سے 'حیات جاوید' کی ہر عبارت حرف آخر ٹھہری اور اس کے مشتملات کے بارے میں تحقیق اور تصدیق کی کوشش نہیں کی گئی اور سر سید کی حیات اور خدمات کے بارے میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں میں 'حیات جاوید' کے مشتملات کو من وعن پیش کر دیا گیا جن میں

معاصر ہندستان کے معروف اور مستند تاریخ نگاروں کے نام بھی شامل ہیں۔ بہر حال، جب قدوائی صاحب نے سرسید کی صحافت پر تحقیق کے دوران ان کی صحافت کے تمام حوالوں خاص طور پر 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ'، 'تہذیب الاخلاق'، 'خیر خواہان مسلمانان ہند'، 'زبدۃ الاخبار' اور 'اودھ اخبار' کا مبسوط مطالعہ کرنا شروع کیا تو محسوس کیا کہ اب تک مطالعات سرسید میں معروضیت کے بجائے عقیدت کی فضا طاری ہے اور مولانا حالی کے بیانات کو تحقیق کے جدید ترین اصولوں کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، جسکی وجہ سے 'حیات جاوید' کے مشتملات ہی سے سرسید شناسی کی کوشش کی جاتی ہے۔ مصنف کو اس بات کا اعتراف ہے کہ 'حیات جاوید' کو سوانح حیات کے مرکزی حوالے کی حیثیت تو ضرور حاصل ہے لیکن مولانا حالی نے اس کتاب میں ''تحقیقی معروضیت کا لحاظ نہیں رکھا ہے'' اس لیے اس کی تحقیق کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں سرسید کے خاندانی پس منظر، خانگی حالات، اولاد، تعلیم ،ملازمت اور مختلف سرکاری اداروں جیسے وائسرائے کونسل، پبلک سروس کمیشن اور ایجوکیشن کمیشن سے وابستگی کے بارے میں مروجہ بیانات اور خیالات کے بارے میں اپنی نادر تحقیق پیش کی ہے اور معتبر حوالوں کی مدد سے اس باب میں مروجہ بیانات اور خیالات کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے، یہ کتاب مطالعات سرسید میں ایک اہم اور منفرد اضافہ ہے جس کا تحقیقی انداز اور علمی اسلوب قابل تعریف ہے اور لائق تقلید بھی۔

براؤن بک پبلی کیشنز نے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے جو قدرے نیا نام ہے لیکن ایک مختصر مدت کے دوران اس نوزائیدہ اشاعت گھر سے تاریخ، ادب، تہذیب اور صحافت کے موضوع پر جس قسم کی معیاری کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اس سے اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سجاد اختر کی وسعت نظر اور جمالیاتی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے کتابوں کی اشاعت میں معنوی اور صوری دونوں خوبیوں کا لحاظ کیا ہے اور لگاتار اس کا التزام بھی کر رہے ہیں جو ایک قابل رشک قدم ہے۔ موضوع اور طباعت دونوں لحاظ سے اعلی اور خوبصورت کتابوں کو دیکھ کر مہدی افادی کہا کرتے تھے ''عروس جمیل درلباس حریر'' براؤن بک پبلی کیشنز کی کتابیں دیکھ کر یہی لگتا ہے، اللہ کرے یہ سفر کامیابی کے ساتھ جاری رہے۔

☆☆☆

براؤن بک پبلی کیشنز کی چند اہم مطبوعات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف/مرتب	قیمت
1	حرف شوق	مختار مسعود	₹ 600
2	نیلی بار	طاہرہ اقبال	₹ 795
3	بنیادی تنقیدی تصورات (تعبیری/تناظرات)	الیاس بابر اعوان	₹ 650
4	اردو نظم میں فطرت کی پیش کش	ڈاکٹر زینت جبیں	₹ 795
5	سرسید کی صحافت	اصغر عباس	₹ 500
6	جدید اردو مثنوی فن اور فکری ابعاد	ظفر انصاری ظفر	₹ 700
7	اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ	انوار احمد	₹ 1000
8	متن، سیاق اور تناظر	ناصر عباس نیر	₹ 500
9	مسائل ومباحث	ریاض الرحمان شیروانی	₹ 500
10	اردو فکشن کے مضمرات	ابوالکلام قاسمی	₹ 500
11	دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو (جلد اول و دوم)	ریشماں پروین	₹ 700, 500
12	کارگہہ کوزہ گراں	عقیل احمد	₹ 500
13	جلوۂ دانش فرنگ	عبدالرحیم قدوائی	₹ 350
14	افسانے کا منظر نامہ (اردو افسانے کی مختصر تاریخ)	مرزا حامد بیگ	₹ 300
15	اردو ادب کی خواتین ناول نگار	نیلم فرزانہ	₹ 600
16	اردو نصاب اور مدارس	توقیر راہی	₹ 399
17	فرائڈ کی تناظر	تہذیب صدیقی	₹ 199
18	سوانح سرسید: ایک بازدید	شافع قدوائی	₹ 300
19	حیرت سرائے کی کہانیاں (جلد دوم)	اطہر صدیقی	₹ 450
20	خلیل الرحمان اعظمی کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ	ثمرین جہاں	₹ 500
21	شخصیات کلام اقبال	محمد نہال الدین	₹ 600
22	اقبال تنقید (مسائل ومباحث)	نور فاطمہ	₹ 600
23	جہات سرسید	شمس بدایونی	₹ 250
24	اردو ناول: تعریف تاریخ اور تجزیہ	صغیر افراہیم	₹ 500
25	چہرہ بہ چہرہ روبرو	سیما پرویز	₹ 300
26	کئی چاند تھے سرآسماں: ایک تجزیاتی مطالعہ	رشید اشرف خاں	₹ 300
27	رسمیات مقالہ نگاری	معین الدین عقیل	₹ 95

Monthly **FIKR-E-NAU** Aligarh

September 2019